رمضان المبارک۔ ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ
جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۵ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

(گیارہواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت475روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

(آٹھواں ایڈیشن) ——— صفحات321، قیمت425روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ

(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات331، قیمت425روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف

(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات394، قیمت485روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ

(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات480، قیمت575روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات

(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات484، قیمت590روپے

حصہ ہفتم سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس

(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات560، قیمت650روپے

ناشر انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

ڈسٹری بیوٹر مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

جلد ۳۴ شمارہ ۳

رمضان المبارک۔ ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل: publications@tanzeem.org
سالانہ زرِتعاون: 200 روپے، فی شمارہ: 50 روپے

اس شمارے میں

حرف اول

اسلامی علمیت بمقابلہ سائنسی جدیدیت	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکر و تدبر

ملاكُ التأويل	ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن	11

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افادات حافظ احمد یارؒ	35

حکمت نبویؐ

سورۃ الاخلاص اور فطرتِ انسانی	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	57

حقیقت دین

قرآن کریم اور فطرتِ انسانی	نذیر احمد علائی	60

مطالعۂ سیرت

علامہ شبلی کی سیرت نگاری	امتیاز عبدالقادر	75

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	83

بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی علمیت بمقابلہ سائنسی جدیدیت

ڈاکٹر ابصار احمد

جمہور علمائے ربانی اور متکلمین سلف کے نزدیک جہاں ایک طرف اسلام اور اس کے اوامر ونواہی اپنی ساخت اور بناوٹ میں اور اسلامی نظام حیات (یعنی شریعت) فی نفسہ معقول المعنی تصور کیا گیا ہے' اس کے مسائل واحکام میں تعلیل ومصالح کے مضمرات نفوسِ مزکی کو ہمیشہ نظر آئے ہیں' وہاں دوسری طرف اسی عقل وفہم کو حقیقی اور مصدقہ (authentic) سمجھا گیا جو قرآن وسنت سے مستفاد ومحصور ہے۔ جس کی بنیاد خدا شعوری' احساسِ بندگی' تقویٰ اور آخرت طلبی ہے اور جو اپنی محدودیت سے آگاہ ہے۔ دراصل قرآن کی الٰہیاتی علمیات کے مطابق منزل من اللہ حقائق کا فہم ہی اصل تعقل' تفکّر' تذکّر اور علم وفہم کے در وا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے جا بجا اس امر کی صراحت کی ہے کہ وحی الٰہی کی غرضِ تنزیل ہی یہ ہے کہ لوگ عقل وفکر سے کام لیں۔ یعنی قرآن وسنت کے بیان کردہ حقائق ومعارف کا گہرا شعور اور فہم ہی حقیقی تعقّل وتفکّر اور تدبّر ہے جو مبدأ ومعاد کی گتھیاں حل کرتا ہے۔

اسلامی عقائد وتعلیمات کی داخلی نورانیت اور حکمت ہی کے باعث اسلام کے دفاع کے لیے متکلمین گروہ در گروہ سامنے آئے اور اس کے معارف وحکم پر تصانیف قلمبند کیں۔ غزالی' عز الدین بن عبدالسلام اشعری' خطابا' ابن تیمیہ' حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر علمائے اسلام نے عقائد کے مباحث سلجھائے اور عبادات کے اسرار ورموز واضح کیے۔ علوم القرآن' علوم الحدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ الٰہیات اور فکر وفلسفہ میں متذکرہ بالا اور ان کے پائے کے بیسیوں دوسرے مشاہیر اسلام نے ہمارے دین اور تہذیب کی اسلافی روایت کی بنیادیں بالوضاحت قائم کی ہیں۔ جن میں ایک طرف علمیات' اخلاقیات' معاشرت ومعیشت اور جملہ مابعد الطبیعیاتی مباحث پر قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی تعلیمات انتہائی حکیمانہ اور بصیرت افروز انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف الحاد وزندقہ اور گمراہ فرقوں کے خیالات پر چشم کشا نقد وتبصرہ ہے۔ الغرض اسلامی علمیت کی تشکیل' ایمان' تقویٰ' تدین اور روایت کے حوالوں سے ہوتی ہے جو قطعی وحتمی ایقان فراہم کر کے نہ صرف ذہنی وقلبی آسودگی عطا کرتی ہے بلکہ اخروی نجات اور فوز وفلاح کی ضامن بھی ہے۔

بدقسمتی سے یورپ میں برپا ہونے والی تحریک نشاۃ ثانیہ اور جدیدیت (modernity) نے وحی الٰہی پر مبنی مذہبی علمیت پر کاری ضرب لگائی۔ فکری سطح پر جدیدیت کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کا مغربی استعمار کے تحت آنا اور اب حالیہ گلوبلائزیشن نے ہمارے ہاں کے اچھے خاصے دینی ذوق رکھنے والے تعلیم یافتہ حضرات اور یونیورسٹی اکیڈیمیا کو بھی متاثر کیا۔ اور انہوں نے سائنٹفک ورلڈ ویو یا بالفاظ دیگر 'سیکولرزم' کو علمی طور پر قبول کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی ہر طرح کی تعبیری تراش خراش کی۔ اور اس طرح دین متین متجدّدین کی فکری تاخت کا نشانہ بنا

اور دینی اباحیت پسندی نام نہاد روشن خیالی' آزادروی اور انکارِ شریعت کی صورت میں سامنے آئی۔ اس کا شکار بعض وہ دانشور بھی ہوئے جن کی ابتدائی تعلیم وتربیت نہ صرف دینی ماحول میں ہوئی تھی بلکہ وہ جامد مذہب سے آگے اسلام کے تحریکی تصور سے بھی واقفیت رکھتے تھے' جس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کا اہم رول رہا ہے۔ اسی قسم کی ایک کیس سٹڈی پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد کے جدیدیت کے زیر اثر اسلامی عقائد اور شرعی احکامات کی تاویلاتِ جدیدہ ہیں جن پر علمی محاکمہ نوجوان مصنف محمد ظفر اقبال نے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''اسلام اور جدیدیت کی کشمکش'' میں کیا ہے۔ راقم نے اس کتاب پر تعارفی اور تبصراتی مقالہ بعنوان ''اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی'' ماہنامہ میثاق بابت جولائی ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر منظور صاحب کا تفصیلی تذکرہ اور صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے تعلق کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ قارئین کے لیے ان کا ابتدائی مختصر تعارف یہ ہے: پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور فیکلٹی ڈین تھے۔ بعد ازاں وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی' ریکٹر اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد اور ممبر اسلامی نظریاتی کونسل رہے۔ گزشتہ لگ بھگ پندرہ سال سے کراچی میں عثمان انسٹیٹیوٹ کے صدر نشین ہیں۔ آپ نے ٹیلی ویژن پر علمی موضوعات کے مذاکروں میں کئی برس شرکت کی اور دانشور کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اب خرابیٔ صحت اور پیرانہ سالی کے باعث زیادہ فعال نہیں ہیں۔

کراچی میں بی اے اور ایم اے کی تعلیم اور بعد ازاں ملازمت کے دوران ڈاکٹر منظور صاحب کا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت کی مرکزی ٹیم سے رہا ہے۔ ان کے احباب میں پروفیسر خورشید احمد صاحب' ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری' مرحوم خرم مراد' برادر مکرم اسرار احمد مرحوم' قاضی عبدالقادر صاحب' ڈاکٹر انیس احمد اور دوسرے اہم اور تحریکی طور پر فعال لوگ رہے ہیں۔ منظور صاحب کا ذاتی طور پر میں احسان مند ہوں کہ جب میں نے اسرار بھائی کی خواہش پر منٹگمری (حال ساہیوال) سے migration کر کے 1963ء میں شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ کیا تو منظور صاحب نے مجھے شعبے کے اساتذہ سے متعارف کروایا' جن میں خاص طور پر صدر شعبہ ڈاکٹر محمد محمود احمد' انصاری صاحب' انیس احمد صاحب اور اکرام علی صاحب تھے۔ وہ خود چند دن بعد لندن ڈاکٹریٹ کے لیے روانہ ہو گئے' اس لیے مجھے کبھی ان کا باقاعدہ سٹوڈنٹ ہونے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ چونکہ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے BA کے پہلے سال کا امتحان فرسٹ ڈویژن اور فلسفے کے مضمون کے ساتھ کیا ہوا تھا' اس لیے میں نے آنرز دو سال میں (یعنی 1965ء میں) اور اگلے سال ایم اے کر لیا۔ آرٹس فیکلٹی میں ایم اے میں پہلی پوزیشن لینے پر مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے میرٹ سکالرشپ ملا جو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے سائیکالوجی کا ایک سال پڑھنے کے بعد avail کیا۔ کراچی سے اکتوبر 1967ء میں لندن روانہ ہوتے ہوئے بڑے بھائی مرحوم اقتدار احمد صاحب نے عزیز و اقارب اور احباب کے لیے ہوٹل فاروق میں الوداعیہ کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں بھی ڈاکٹر منظور احمد' جو ایک سال قبل ڈاکٹریٹ مکمل کر کے کراچی یونیورسٹی واپس آ چکے تھے' میری درخواست پر تشریف لائے۔ اور مجھے تعلیمی ہدایات کے علاوہ ہیتھرو ایئرپورٹ سے سنٹرل لندن پہنچنے اور پھر ہائی کمیشن سے سکالرشپ کی رقم کے حصول' اور پاکستان سٹوڈنٹس ہاسٹل کے ایڈریس

کے بارے میں بہت مفید tips دیئے جو میرے بہت کام آئے۔

لندن روانگی سے قبل منظور صاحب باریش تھے' لیکن تین سال بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ واپسی پر چہرہ اس سنت سے ''صاف'' تھا۔ آنکھوں کی تیزی' چال ڈھال اور اندازِ گفتگو سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ بر بیک کالج لندن میں پروفیسر ہیملن (Prof Hamlyn) کی نگرانی میں کام کیا اور Concept of Sense Data پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ بادیٔ النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گہرائی میں اتر کر کسی substantive ایشو پر تحقیقی کام نہیں کیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ زیادہ وقت Bloomsbury Group کے مماثل لوگوں کے ساتھ میل جول رہا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ آپ کی رہائش ہمیسٹڈ ہیتھ (Hempsted) جیسے علاقے میں رہی جہاں میرے خیال میں کوئی مسجد بھی اس وقت نہیں تھی اور آبادی بالعموم کلچرل ایلیٹ پر مشتمل تھی۔ پروفیسر ہیملن ہی کے تحت بعدازاں پروفیسر اکرام علی صاحب نے Problem of Time پر ریسرچ کی اور (بقول ان کے) انہوں نے ہیملن کو تاریخ فلسفہ سے بالکل نابلد پایا۔ گویا شاگرد نے استاد کو پڑھایا۔ انگلستان میں اس وقت زیادہ تر اساتذۂ فلسفہ لسانی تحلیلی فلسفے کے منہاج میں دلچسپی لیتے تھے اور modernity کے اصول وضوابط' ذہنی افق اور انسان مرکزی منہاجِ علم بالعموم ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ جدیدیت پر مبنی ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا mind-set اسی دور کی legacy معلوم ہوتا ہے جسے انہوں نے دین حق کی تفہیم میں بھی استعمال کر کے زبردست ٹھوکریں کھائیں' جو محمد ظفر اقبال صاحب نے بالتفصیل واضح کی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالعموم خاص مذہبی عربی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کا مفہوم متعین فرما لیتے ہیں' اور پھر اس پر اپنے خیالات وافکار کی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔ حالانکہ استعمال کی گئی صرف اصطلاح اسلامی ہوتی ہے اور اس کا مفہوم منظور احمد کا خود معین کردہ ہوتا ہے' جو بالعموم اسلام کی چودہ سو سالہ علمی و مابعد الطبیعی روایت کے منافی ہوتا ہے۔ ''اسلام چند فکری مسائل'' میں 'اجتہاد' اور 'مقاصد الشریعہ' کے حوالے سے کی گئی گفتگو یہی ثابت کرتی ہے.....

متعلقہ موضوعات پر عربی میں تصنیف شدہ کتابوں کے مطالعے سے محرومی' دین کے اساسی وقانونی اور مابعد الطبیعی حقائق ومسائل کو مغربی فکر وفلسفے کی روشنی میں پڑھنے اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کو ''نتیجہ خیز'' سمجھنے' اور عاجلانہ نتائج نے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مطبوعہ مضامین ومقالات میں عجیب قسم کا ابہام وتضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے وہ مسائل جن پر ڈاکٹر صاحب نے قلم اٹھایا ہے اس پر ان کا اپنا ذہن صاف اور واضح نہیں ہے اور وہ صورت مسئلہ کے درست فہم سے قاصر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی' بادیٔ النظر میں' دلکش پیرائے میں لکھی گئی تحریریں' بجائے تشکیک اور شبہات کم کرنے کے اسے اور بڑھا دیتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں جدید مسائل کے حل کی فکری رہنمائی تو دور کی بات ہے' بعض اوقات خود دین و مذہب ہی واہمہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتہائی نازک' حساس' علمی اور فکری مبحث میں بغیر تیاری کے ہاتھ ڈال دیا گیا ہے۔

فلسفے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ہر شے کو سوالات کی تلوار پر رکھ لیتا ہے' لیکن اس کا مؤثر اور قطعی جواب فراہم

نہیں کرتا۔ شک کا دروازہ کھول دیتا ہے مگر اسے بند نہیں کرتا۔ فلسفہ کھلے ذہن کا ثمر ہے' یعنی فلسفی ایک ایسا آدمی ہے جس کا منہ ہمیشہ کھلا رہے۔ سوالات کرنا اور اعتراض اٹھانا ہی اس کا کام اور اس کی پہچان ہے۔

Philosophy questions everything and settles nothing, some reassurance may be found in the words of the late English journalist-critic G.K. Chesterton, who remarked, "Merely having an open mind is nothing. The object of opening the mind, as of opening the mouth, is to shut it on something solid.

ڈاکٹر منظور احمد صاحب خالص عقائدی اور دین و قانون کی اساس پر استوار مسائل کو عقلی مابعد الطبیعیات اور فلسفیانہ (یعنی شک کے) نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں' یہی بات وہ تصوف کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ:

''میرا علم ان مضامین (یعنی تصوف وغیرہ) کے بارے میں فلسفے کے حوالے سے ہے اور ان مسائل کو میں اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں جس کو فلسفیانہ طریق کار کی روشنی میں صحیح سمجھتا ہوں۔''

درحقیقت ڈاکٹر منظور احمد دین کے ہر عقائدی' احکامی و قانونی مسئلے بلکہ نفسِ دین تک کو' اس کے اپنے طریقِ تفہیم کی بجائے' فلسفیانہ جہت سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ خود یہ لکھ چکے ہیں:

''روایت اور جدیدیت کے درمیان کوئی بامعنی مکالمہ ممکن نہیں' اس کا امکان صرف ایک تیسرے نقطہ نظر سے ہوسکتا ہے جو ان دونوں مفاہیم کو ایک معروض کی حیثیت سے دیکھ سکے اور پھر دونوں کا کچھ نہ کچھ ادراک حاصل کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں کی تفہیم کے لیے ایک تیسری کلامی منطق کی ضرورت ہوگی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی جدیدیت کے پیراڈائم سے روایت کے پیراڈائم میں منتقل ہو جائے یا روایت سے جدیدیت میں' اس طرح وہ پہلے پیراڈائم کو ماضی کی ایک غلطی سمجھ کر یاد رکھے۔ ان طریقوں کے علاوہ میری نظر میں کوئی اور طریقہ روایت اور جدیدیت کے مابین نزاع کی تفہیم کا ممکن نہیں۔''

جب ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو خود اس بات کا اعتراف و ادراک ہے کہ روایت و جدیدیت کی اپنی اپنی کلامی منطق [جو اپنے طریق تفہیم اور نظام ہائے تصورات میں ایک دوسرے سے کلیتاً متخالف و متغائر ہیں] سے بلند ہو کر ایک تیسری کلامی منطق کی دریافت کے بغیر دونوں نظاموں کے مابین نزاع کو ختم نہیں کیا جا سکتا' تو اس صورت میں جبکہ وہ علوم اسلامی پر سند یافتہ نہیں ہیں اور خود کو مغربی فلسفے کا پرداختہ اور مرہونِ کرم گردانتے ہیں —— وہ خود ہی غور فرمائیں کہ انہیں یہ استحقاق کیسے حاصل ہو گیا کہ روایت اور جدیدیت کے درمیان حَکَم اور ثالث بن کر فیصلے صادر کرنے لگیں؟ خصوصاً جبکہ وہ ''علم تفسیر'' کے نتیجہ خیز معیارات کو مغربی فکر سے مستعار قرار دیتے ہوں اور تصوف اور اس کی مابعد الطبیعیات جیسے روایتی مضامین کو فلسفیانہ طریق کار کی روشنی میں درست یا غلط سمجھنے کے عادی ہوں۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے فلسفیانہ افکار و خیالات کے مطالعے سے خلّاق بصیرت اور تخلیقی ذہانت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے سے موجود افکار و نظریات کے محض ناقل اور ترجمان نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر منظور صاحب کے اسلام' شریعتِ محمدیہ' مقاصدِ شریعت اور پاکستان کے بارے میں وہ خیالات و افکار جو انہوں نے جدیدیت اور سیکولرازم سے متاثر ہو کر تحریر کیے ہیں' کتابوں یا جریدوں کے علاوہ اخبارات

میں بھی شائع ہوئے' جن کا نوٹس بعض دوسرے اصحابِ فکر کے علاوہ برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لیا اور یہ قسط وار ایک موقر اخبار میں چھپے۔ چنانچہ باوجود اختلاف کے' ڈاکٹر منظور صاحب اور اسرار بھائی میں پرانے تعلق کے بنا پر میل ملاقات رہتی تھی اور تبادلہ خیالات بھی ہوتا تھا۔ میرے سامنے اس وقت ڈاکٹر منظور صاحب کا 13/اگست 2002ء کا لیٹر ہیڈ پر محررہ خط ہے جو ڈاکٹر اسرار صاحب اور مجھے ارسال کیا گیا تھا۔ ان کے ہاں ماہانہ فکری نشست ہوتی تھی (نمعلوم اس کی کیفیت اب کیا ہے)۔ اس دعوت نامے میں ان کے 'ڈان' کے 23 جولائی (2002) میں شائع ہونے والے مضمون A Closed mind کی عکسی نقل لف تھی اور ساتھ ہی 'ڈان' ہی میں شائع ہونے والے ایک تائیدی خط کی نقل بھی۔ یہ مختصر خط پروفیسر زبیر بن عمر کا تھا۔ اتوار 25/اگست کو اس موضوع پر تبادلہ خیال کے لیے گھر پر نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دو ایک مرتبہ اسرار بھائی کے خیالات جاننے اور ان پر نقد وتبصرہ کے لیے انہیں پوری نشست کے لیے مقرر کے طور پر بھی مدعو کیا گیا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ کئی سال ماہانہ ہونے والی ان علمی محافل کے حاصلات کیا رہے' اور کیا زبیر بن عمر صاحب نے ان کی تدوین اور انضباط کے بعد ان کو تحریری شکل دے کر شائع کیا یا نہیں۔

محولہ بالا 'ڈان' میں شائع ہونے والے مضمون کا عنوان ہی بتا رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک راسخ العقیدہ مسلمان کو بالکل dogmatic اور بند 'ذہن' سمجھتے ہیں جس میں ''روشنی'' کا گزر قطعاً نہیں ہے' اس کے عقائد اندھے' بہرے' غیر منطقی اور ہر قسم کی عقلیت سے بے بہرہ ہیں۔ فلسفے سے واقف قارئین کے ذہن میں کارل پوپر کی کتاب کا ٹائٹل آ جانا چاہیے "The Open Society and its Enemies"۔ مشمولہ کے اعتبار سے دونوں میں مماثلت بھی ظاہر و باہر ہے۔ زیادہ تفصیل کی یہ تحریر متحمل نہیں ہو سکتی۔ مختصراً منظور صاحب اسلام کی متواتر روایتی تفہیم کو ''فقہی اسلام'' سے تعبیر فرماتے ہیں' جسے ان کے خیال میں اصول نہیں بنانا چاہیے' لکھتے ہیں:

> ''زندگی کے منجملہ معاملات کو نبٹانے کے لیے قدماء کی آراء اور فیصلے مدد و معاون تو ثابت ہو سکتے ہیں' لیکن ان کو حتمی اصول بنا کر ان سے استخراج کو ایک ناقابلِ تردید حقیقت سمجھنا ممکن نہیں''۔ (مشمولہ سہ ماہی المعارف ''نیاز' روشن خیالی.....)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ فکری بنیاد جس پر معاشی ترقی' تصوراتی ارتقاء اور تکنیکی ترقی ممکن ہے..... یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت کے روایتی خوشہ چینی طریق کار کو چھوڑ کر اس پر نئے سرے سے نظر ڈالی جائے''۔ (عصرِ حاضر میں اسلام کی تفہیم' مشمولہ اسلام' چند فکری مسائل' ص ۶۸)

فقہاء اور قدماء کی منصوص و متفقہ آراء کے برعکس ان سطور سے ڈاکٹر منظور احمد صاحب قرآن وسنت ہی کو حتمی اصول مان کر اس سے استخراج کو واضح طور پر اسلامی شریعت کے منافی رویہ سمجھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے نیاز فتح پوری جیسے پراگندہ اور باطل خیال شخص کو جدید اسلام کا ''روشن خیال ذہن'' اور چہرہ قرار دے کر دین متین کی کوئی مثبت خدمت سرانجام دی ہے یا بہت سے ژولیدہ فکر کے حامل دانشوروں کی آواز میں آواز ملائی ہے' جن کی فہرست اگرچہ طویل ہے لیکن ان میں چند نمایاں ہیں' مثلاً پروفیسر محمد ارکون' ڈاکٹر طارق

رمضان' راشد شاذ' ضیاء الدین سردار وغیرہ۔میرے خیال میں ڈاکٹر منظور بالعموم شک و ارتیاب اور uncertainty کومنہاجیات اور فلسفے میں بنیادی اہمیت دیتے ہوئے برٹرینڈل رسل کے لبرل ازم کے اصول عشرہ (A liberal decalogue) کے قائل نظر آتے ہیں۔

جدیدیت کا سنڈروم گزشتہ چھ سات دہائیوں کے دوران عالمی سطح پر اسلام کے حوالے سے متعدد شناختی عنوانات (Labels/adjectives) کے ساتھ استعمال ہوا ہے' مثلاً لبرل اسلام' موڈریٹ اسلام' روشن خیال (enlightened) اسلام' ریفارمسٹ اسلام' پولیٹکل اسلام وغیرہ۔اسلام کو اس صورت میں پیش کرنے والوں میں ایک نام ضیاء الدین سردار پچھلے آٹھ دس برسوں سے اپنے آپ کو اور اپنے ہم خیال حلقے کو کریٹیکل مسلمان (The Critical Muslim) کا لیبل اور اسلام کا وہ version پیش کر رہے ہیں کہ بقول شاعر ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی''۔ سردار فکری طور پر تحولِ عظیم سے گزر کر اب وہ نہیں رہے جو وہ Afkar/Enquiry کے زمانے میں تھے۔کریٹیکل مسلم کی حیثیت سے بغیر ضروری تیاری کے بزعم خویش مفسرِ قرآن' شارحِ شریعت اور مجتہد سبھی کچھ ہیں اور الٹرا جدیدیت کی راہ پر بگٹٹ رواں دواں ہیں۔اڑھائی تین ماہ قبل انہیں اکتیس سال بعد (پہلی ملاقات شکاگو کے ہالیڈے اِن میں ایک ڈنر کے موقع پر 1984ء میں ہوئی تھی) جب لاہور لٹریچر فیسٹیول میں ڈاکٹر ہود بھائی کے ساتھ مکالمہ کرتے دیکھا' تو بہت قلق اور حیرت و مایوسی اس اعتبار سے ہوئی کہ عالمی شہرت کے مسلم دانشور ڈریس اور صحت کے اعتبار سے ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔

اس تحریر کا اختتام اپنے چند تاثرات کے مختصر بیان پر کروں گا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستانی جامعات اور دانش گاہوں کے فاضلین اور پروفیسر حضرات اسلام سے معمولی سا جذباتی تعلق تو رکھتے ہیں' لیکن بالعموم قرآن وسنت اور دینی علمی وعرفانی روایت کا علم نہیں رکھتے اور اسلاف کی شاندار اور انتہائی بصیرت افروز تحریروں سے بالکل ناواقف ہیں۔جبکہ مغربی دنیا میں ہمیں کئی ایسے فلسفی اور مفکر ملتے ہیں جو اپنی دو اڑھائی ہزار سالہ تہذیبی تاریخ اور اس کی علمی روایت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اپنی فکری کاوشوں میں ان کا حوالہ دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان حوالوں سے وہ اپنے خیالات کو زیادہ مثبت انداز میں پیش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں الیسڈیئر میکنٹائر اور چارلس ٹیلر اور بعض دوسرے دانشور سرفہرست ہیں۔ان جیسی جامعیت' علمی بصیرت اور گہرا تاریخی شعور رکھنے والے اساتذہ اور لکھنے والے ہمارے ہاں سوائے چند کے عنقا ہیں۔

راقم کو مذکورہ مفصّل کتاب کے مندرجات اور سہ ماہی 'جی' کے گزشتہ شمارے میں مدیر جناب محمد دین جوہر کی بعض تحریروں بالخصوص ''دین حق کی جدید تعبیرات'' میں گہرا توارد نظر آتا ہے' جو اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن گہرائی اور معنویت کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ڈاکٹر منظور صاحب کے حوالے سے بدقسمتی کا معاملہ ایک یہ بھی ہوا کہ وہ کراچی یونیورسٹی میں لندن جانے سے پہلے ذہین شاہ تاجی سے تو متعارف کرائے گئے لیکن شاید مولانا محمد ایوب دہلویؒ کی انتہائی غامض دینی اور منطقی گفتگوؤں سے استفادہ نہ کر سکے۔جدیدیت اور سیکولر فکر کے زیر اثر پروفیسر منظور صاحب' غامدی صاحب اور دوسرے ہم خیال اصحابِ دانش کے بارے میں جوہر صاحب نے کیا خوب لکھا ہے: ''جو دینی فکر اب تداول کا درجہ اختیار کر چکی ہے اس کا مسئلہ یہی ہے کہ ایک دن 'فکر' کا

جھنجھنا ہاتھ میں رہ جاتا ہے اور دین رخصت ہو جاتا ہے''۔ وہ بالکل بجا طور پر عصرِ حاضر میں دینی فکر کو آشفتگی کا شکار خیال کرتے ہیں اور ایک مضبوط فکری حصار کو دین کے لیے ازبس ضروری قرار دیتے ہیں۔ تاہم میں بصد ادب گزارش کرنا چاہوں گا کہ مضبوط فکری حصار کہیں خلا میں معرضِ وجود میں نہیں آتا' بلکہ دین سے کمٹمنٹ رکھنے والے ہم خیال اور عملی طور پر پروایکٹو اصحاب کی جمعیت کا متقاضی ہے۔ جوہر صاحب کا یہ جملہ ''دین میں حضور ﷺ کی مرکزیت کو مشتبہ بنائے بغیر جدید دینی تعبیر کے کام کا آغاز بھی نہیں ہوسکتا''، جدیدیت کے اسیر حضرات کی سو فیصد صحیح نبّاضی کرتا ہے۔ لیکن اس کا علاج صرف 'ارزانی سخن' سے ممکن نہیں بلکہ خواص اور عوام دونوں کی سطح پر سنت رسول ﷺ کی شرعی حجیت' عمل میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اس کو اپنانے اور رسالت کے مشن کی عالمی لیول پر تکمیل کے لیے جدوجہد میں ہے۔

جدیدیت اور سیکولر فکر کا اسلام کے روایتی فکر سے جو قرآن وسنت اور قرنِ اوّل کے اصحابِ علم وتقویٰ کے اقوال واعمال کا تسلسل ہے' جوہری فرق ہے۔ 'روایت' (tradition) کا لفظ ایک دوسرے محدود معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے' جو شوآن' حسین نصر اور دوسرے متصوفین کی نگارشات میں ملتا ہے۔ یہ حضرات صرف فرد کی ذاتی اصلاح اور روحانی بالیدگی پر اپنا فکر مرکوز رکھتے ہیں' اور اس طرح مابعد جدیدیت کی مذہب کی وہ تعریف قبول کر لیتے ہیں جس میں مذہب کو فرد کے باطنی اطمینان اور آسودگی تک محدود کر کے اسلام کے اجتماعی نظم اور ہیئت سیاسی سے قطعاً اعتناء نہیں کیا جاتا' چنانچہ عالمی سیاسی وتہذیبی سطح پر یہ لوگ اسلام کو ایک بالکل غیر مؤثر اور انتہائی محدود تناظر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جبکہ راسخ العقیدہ اور بالغ نظر علمائے حقانی نے اسلام کو بحیثیت دین جو فرد اور اجتماع (polity) دونوں کو راہنمائی وہدایت دیتا ہے' اپنی کلیت میں پیش کیا ہے اور روایت کو بلا استثناء ٹھیٹھ فقہی معنی میں لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پس جدیدیت کے افکار نے اور اس لٹریچر نے جو مغرب میں خود مغربی زبانوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیر اثر ہونے والی تہذیبی اور تمدنی خرابیوں کے بارے شائع ہوا ہے' گزشتہ صدی کے وسط تک قائم سائنسی / سیکولر سوچ کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اور اب مغرب ہی میں متعدد نومسلم حضرات اسلام کے بنیادی مصادر اور مراجع کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کر کے دین متین کی حقانیت کو بلند ترین علمی سطح پر پیش کر رہے ہیں' گویا بقول علامہ اقبال: ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

آخر میں 'الدِّین النَّصیحَة' کی سپرٹ میں میری دعا اور دلی تمنّا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو توفیق اور ہمت ارزانی کریں کہ وہ اپنے خیالاتِ باطلہ کے حوالے سے اعلانِ براءت اور اظہارِ تقصیر کر کے اپنی عاقبت سنوار لیں۔ آمین!

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن

تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I, II, III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-35869501

Email: distancelearning@tanzeem.org

مَلاكُ التأوِيل (۲)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص و ترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورة البقرة

(۴) آیت ۱: ﴿الٓمّٓ ①﴾

میں توفیقِ الٰہی سے عرض کرتا ہوں کہ سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطّعات کے بارے میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں وہ اپنی کثرت کے باوجود صرف دو باتوں میں منحصر ہیں۔

اوّل: ان کی تاویل نہ کی جائے بلکہ ان پر ایسے ہی ایمان لایا جائے جیسے وہ وارد ہوئے ہیں' بلکہ ان کے بارے میں بات نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

دوم: زبانِ عرب کے اعتبار سے ان کی تاویل کی جائے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی کو ہم حق سمجھتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ عربوں کو قرآن جیسی کتاب یا اس کی سورتوں جیسی سورت یا اس کی آیات جیسی آیت لانے کا چیلنج دیا گیا تھا اور پھر یہ کہ وہ لوگ اہل زبان تھے اور اس کے باوجود اس چیلنج کو پورا نہ کر سکے اور یوں ان پر اور تمام مخلوقات پر حجت قائم ہوگئی۔ اور جب ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قرآن میں ایسے الفاظ کیسے آ گئے جو ان کے فہم سے باہر تھے؟ ایسی کوئی بات ہوتی تو عرب اس دلیل کو فوراً پیش کرتے کہ جب قرآن میں ایسے حروف یا الفاظ ہیں جو نا قابل فہم ہیں تو ہم اس کا مثل کہاں سے لائیں؟

چنانچہ مفسرین نے ان کے معانی و مطالب پر بہت کچھ لکھا ہے' اور جو بات ہم کہنے جا رہے ہیں' بہت کم لوگوں نے اسے سمجھا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مقصود نہیں کہ یہ حروف کہیں صرف ایک ہیں' کہیں دو یا اس سے زیادہ' بلکہ پانچ تک مذکور ہیں' اور یہ کہ یہ صرف چودہ حروف ہی کیوں ہیں جن کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ ان میں سے اکثر تین تین حروف کا مجموعہ ہیں۔ یہ ساری باتیں اس کتاب کا مقصد نہیں ہیں۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ یہ حروف جس جس سورت کے ساتھ آئے ہیں اُسی کے ساتھ خاص ہیں۔ الم کو المر کی جگہ پر یا حٰم کو طٰس کی جگہ پر یان کوق کی جگہ پر نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ حروف سورت کے افتتاحی کلمات یا مطلع کی حیثیت رکھتے ہیں' گویا یہ ان کے نام ہیں اور بغیر کسی فرق کے ناموں ہی کی طرح انہیں سمجھنا چاہیے' حالانکہ بعض لوگوں نے انہیں نام ہی قرار دیا ہے۔ عربوں کی عادت تھی کہ نام رکھتے وقت وہ مُسمّٰی

(جس کا نام رکھا جا رہا ہے) کی کوئی نادر اور یکتا صفت کو یا اس کے انتہائی نمایاں اخلاقی پہلو کو دیکھتے اور اسے ہی اس چیز کا نام قرار دے دیتے۔ اسی طرح نثر و نظم میں کسی امتیازی جملے یا قصیدہ کے مطلع ہی کو نام کے لیے چن لیتے۔ کتابِ الٰہی میں بھی سورتوں کے نام اسی طرح رکھے گئے ہیں۔ اب دیکھئے سورۃ البقرۃ کا نام اس سورت میں وارد گائے کے ایک عجیب پُرحکمت قصے کی بنا پر رکھا گیا۔ سورۃ الاعراف کا نام ''اعراف'' کی رعایت سے رکھا گیا کہ اعراف کا ذکر صرف اسی سورت میں آیا ہے۔ سورۃ النساء میں عورتوں کے بارے میں خصوصی احکامات آئے ہیں' اس لیے اسے سورۃ النساء کا نام دیا گیا۔ سورۃ الانعام کا نام اَنعام (مویشی) پر رکھا گیا۔ اگرچہ دوسری سورتوں میں بھی مویشیوں کا ذکر ہے' لیکن اس سورت میں ﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا﴾ سے لے کر ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ تک (آیات ۱۴۲ تا ۱۴۴ میں) جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ کسی دوسری سورت میں بیان نہیں ہوئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے النساء کا لفظ دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے لیکن جس طرح اس سورت میں عورتوں کے بارے میں احکامات بیان ہوئے ہیں دوسری سورتوں میں بیان نہیں ہوئے۔ سورۃ المائدۃ کا نام مائدہ (دستر خوان) پر رکھا گیا کہ یہ وہ واحد سورت ہے جس میں مائدہ کا ذکر ہے۔ یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ سورۃ ہود کا نام نبی حضرت ہود علیہ السلام پر رکھا گیا حالانکہ اس سورت میں ہود کے علاوہ نوح' صالح' ابراہیم' لوط' شعیب اور موسیٰ علیہم السلام کے قصے بھی بیان ہوئے ہیں بلکہ نوح علیہ السلام کا قصہ تو بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے؟ میں جواباً کہوں گا کہ جی ہاں! ان انبیاء کے قصے سورۃ الاعراف اور سورۃ الشعراء میں بھی بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں لیکن ان تینوں سورتوں میں ہود وہ واحد سورت ہے جس میں ہود علیہ السلام کا نام چار دفعہ آیا ہے' اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے' کسی بات کی تکرار ان بنیادی اسباب میں سے ہے جن کی بنا پر کسی سورت کا نام رکھا جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس سورت میں نوح علیہ السلام کا ذکر چھ دفعہ آیا ہے یعنی ہود سے بھی زیادہ تو اسے حضرت نوح علیہ السلام کا نام کیوں نہیں دیا گیا؟ جواباً ارشاد ہے کہ چونکہ ایک دوسری سورت میں صرف نوح علیہ السلام کا قصہ ہی بیان ہوا ہے تو اسے سورۃ نوح کا نام دیا گیا جبکہ سورۃ ہود میں بشمول نوح کے کئی انبیاء کا ذکر ہے' برخلاف لفظ ہود کے کہ اس نام سے پوری کوئی سورت نہیں اور نہ ہی کسی دوسری سورت میں لفظ ہود دو مرتبہ سے زائد آیا ہے' اس لیے اس سورت کے لیے ہود کا نام سب سے زیادہ موزوں تھا اور اسی طرح یہ ایک قاعدہ سا بن گیا کہ کسی حرف یا لفظ کی تکرار اسے اس سورت کا نام قرار دیے جانے کے لیے مناسب ہے۔

میں اب اللہ تعالیٰ سے سلامتی اور حفاظت کی دعا کے ساتھ کہتا ہوں کہ حروف مقطعات وہ حروف ہیں جو اس سورت کے کلمات میں سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ آپ ایسی کوئی سورت کے حروف اور الفاظ کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ جن حروف مقطعات سے سورت کی ابتدا ہوئی ہے' اس سورت کے کلمات میں یہ حروف کثرت سے آئے ہیں اور اس کا مقابلہ اس کے برابر کسی دوسری سورت سے کر لیں تو ثابت ہو جائے گا کہ ان حروف کی تعداد پہلی سورت میں کہ جس کی ابتدا حروفِ مقطعات سے ہو رہی ہے' دوسری سے زائد ہے۔

اس قاعدے کو آپ حروفِ مقطعات والی تمام سورتوں پر منطبق کریں تو اسے ٹھیک پائیں گے' اور اسی لیے ''ق'' کو ''ن'' کی جگہ یا برعکس نہیں رکھا جا سکتا کہ ہر حرف اپنے مقام پر ہی موزوں نظر آتا ہے۔ اس وضاحت کی

روشنی میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں کھیعص آیا ہے وہاں حم عسق کو نہیں رکھا جا سکتا' نہ ہی حم کو طس کی جگہ پر' نہ ہی المر کو الم کی جگہ پر' نہ ہی المر کو المص کی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی برعکس صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ہر سورت کے افتتاح میں وہی حروف موزوں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں وارد ہوئے ہیں اور اللہ بہتر جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

(۵) آیت ۲ : ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ متقی لوگوں کے لیے ہدایت کا سبب ہے' اور سورۂ آل عمران کی ابتدا میں توراۃ اور انجیل کے ضمن میں یوں کہا:

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾

''اور اس سے قبل تورات اور انجیل کو اتارا لوگوں کی ہدایت کے لیے۔''

یہاں سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ دونوں جگہوں پر یہ اختلاف کیوں واقع ہوا ہے اور جہاں متّقین کا لفظ ہے کیا وہاں الناس آ سکتا ہے اور بالعکس؟ جواباً عرض ہے کہ جیسا وارد ہوا ہے وہی مناسب ہے اور اس کا عکس مناسب نہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں باتفاق مفسّرین ''الکتاب'' سے مراد قرآن مجید ہے۔ تورات موسیٰ علیہ السلام اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی' اور چونکہ اُمّت محمد ﷺ کی خاص فضیلت ہے اس لیے ان کے حال کو بیان کرنے کے لیے متقین کا لفظ لایا گیا اور باقی دونوں کتابوں کے ماننے والوں کا حال بیان کرنے کے لیے الناس کی تعبیر اختیار کی گئی کہ اس طرح اُمت محمدؐ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے' اور یوں دونوں جگہوں پر وہی لفظ اختیار کیا گیا جو وہاں مناسب تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ تقویٰ کی صفت تب جچتی ہے جب وہ اس کتاب سے ہدایت حاصل کریں' اس کی تصدیق کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں' تو میں جواباً کہوں گا کہ یہاں غایت کا اعتبار کیا گیا ہے' یعنی آخر میں جو کچھ ہونا ہے اس کا خیال رکھا جائے یعنی مآل کا اعتبار۔ یہ ایک وسیع باب ہے اور اس کی ایک مثال اس آیت میں ہے:

﴿اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ﴾ (یوسف:۳۶)

''میں اپنے آپ کو شراب نچوڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔''

(اصل میں تو انگور نچوڑنا تھا' شراب تو اس عمل کے نتیجے میں پیدا ہوگی۔) یوں یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذکورہ دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ پر رکھنا غیر مناسب ہوگا' اور اللہ بہتر جانتے ہیں کہ ان کی کیا مراد ہے۔

(۶) آیت ۹:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹﴾

''وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں' حالانکہ وہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے آپ کو اور انہیں اس کا احساس تک نہیں ہے۔''

اور پھر فرمایا:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲﴾

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝۱۳﴾

پہلی دونوں آیات میں شعور کی اور آخری آیت میں علم کی نفی کی گئی تو اس کا کیا سبب ہے؟

جواب یہ ہے کہ شعور احساس پر دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ شعار سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے وہ کپڑا جو جسم سے مس کرتا ہو تو جسم اسے بغیر کسی فکر اور تدبر کے محسوس کرتا ہے۔ اس احساس میں انسان اور حیوان میں فرق نہیں ہے، لیکن علم فکر و تدبّر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ البتہ بعض اربابِ نظر کے مطابق اس کے مقدمات محسوس بھی ہو سکتے ہیں اور غیر محسوس بھی۔ گویا علم کا تعلق اربابِ عقل و فکر سے ہے اور ایمان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ وہ فکر و نظر یا علم کا محتاج ہے۔ اور یہ فکر و نظر ایک عاقل شخص ہی کا وصف ہو سکتے ہیں جو یہ جانتا ہو کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ منافقون نے مومنوں کو سُفہاء (بے وقوف) کہہ کر ان سے ایمان کی نفی کر دی۔ سفہاء سے ان کی مراد تھی وہ لوگ جو بردباری کے وصف سے عاری ہوں اور معاملات کو جانچنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ ان کا قول یہ تھا: ﴿اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ﴾ ''کیا ہم ایسے ایمان لے آئیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟'' تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں کہا: ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝۱۳﴾ ''خبردار، بیوقوف تو وہ خود ہیں.....'' اور اس طرح ان کے صاحب علم ہونے کی نفی کر دی، یعنی جس چیز کی انہوں نے مؤمنوں کے لحاظ سے نفی کی تھی، اللہ نے ان سے اسی کی نفی کر دی اور جو لقب انہوں نے غیروں کو عطا کیا تھا، اللہ نے وہی لقب انہیں عطا کر دیا۔

اب ملاحظہ کیجیے کہ زمین میں فساد برپا کرنا اور اسے دھوکہ دینا کہ جسے دھوکہ نہ دیا جا سکتا ہو، ایک ایسی بات ہے جو کسی پر مخفی نہیں۔ اس لیے مفسدین کی نسبت سے شعور اور احساس کی نفی کی، یہاں علم کا ذکر غیر مناسب تھا۔ اس لیے دونوں آیات اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہیں۔

اس نکتے کی بابت ابوالفضل بن خطیب ☆ کہتے ہیں:

اوّلاً: یہ کہنا کہ مؤمن حق پر ہیں اور منافقین باطل پر، ایک عقلی اور فکری امر ہے، لیکن نفاق جو کہ سرکشی پر مشتمل ہو اور زمین میں فساد برپا کرنے پر تلا ہوا ہو، ایک امر حسی ہے جس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً: سَفَہ یعنی جَہل کے مقابلے میں علم کا لایا جانا لفظی مطابقت کے لحاظ سے بھی موزوں ہے۔

لیکن جو بات میں نے بیان کی ہے وہ ان آیات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

(۷) آیت ۱۸:

﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۝۱۷ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝۱۸﴾

''اور ان کو تاریکیوں میں ایسا چھوڑا کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بہرے گونگے اندھے ہیں، اور وہ پھر واپس نہ آ سکے۔''

اور پھر آیت ۱۷۱ میں ارشاد فرمایا:

☆ شاید اس سے مراد لسان الدین بن الخطیب، ابوعبداللہ، محمد بن عبداللہ بن سعید السلمانی (۷۱۳۔۷۷۶ھ) ہیں۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾﴾

’’کافروں کی مثال ان (جانوروں) کی طرح ہے جو (اپنے چرواہے کی) صرف پکار اور آواز ہی کو سنتے ہیں (سمجھتے نہیں)‘ بہرے گونگے اندھے ہیں اور وہ عقل نہیں رکھتے۔‘‘

پہلی آیت کا اختتام ’’لَا یَرْجِعُوْنَ‘‘ پر اور دوسری کا ’’لَا یَعْقِلُوْنَ‘‘ پر ہوا‘ تو اس اختلاف کا کیا سبب ہے‘ حالانکہ ان کے جو اوصاف بطور سبب اور علت وارد ہوئے ہیں وہ تو ایک جیسے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں منافقوں کے حال کی تمثیل بیان ہوئی ہے‘ جیسے کہ ایک شخص اندھیری رات میں روشنی کی خاطر آگ جلائے‘ لیکن جونہی آگ بھڑکی‘ اللہ نے اُسے بجھا دیا‘ دوبارہ تاریکی چھا گئی اور اب اس شخص کے پاس وہ روشنی نہ رہی کہ جس کی طرف وہ لوٹتا اور اپنی پریشانی کو دور کرتا۔

دوسری آیت میں کافروں کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ وہ ان بکریوں کی مانند ہیں کہ چرواہا ان پر چیختا چلاتا ہے اور یہ بکریاں صرف ایک آواز سنتی ہیں لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ چرواہا ان سے کیا کہہ رہا ہے۔ ایسے ہی کافروں کی حالت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ نہیں سمجھ پا رہے کہ وہ کیا خطاب کر رہے ہیں اور کیا چاہتے ہیں‘ اسی لیے ان کے بارے میں ’’لَا یَعْقِلُوْنَ‘‘ کہا۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک کافروں کا بکریوں سے تشبیہہ کا تعلق ہے تو اس کا ذکر صراحتاً سورۃ الفرقان کی اس آیت میں آ گیا ہے:

﴿اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَھُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ﴾ (آیت ۴۴)

’’کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کی اکثریت سنتی ہے یا سمجھتی ہے؟ وہ تو جانوروں کی طرح ہیں۔‘‘

تو ان کا جانوروں کی طرح ہونا ظاہر ہو گیا‘ لیکن سورۃ البقرۃ کی آیت میں تو کفار کو اُس چرواہے سے تشبیہہ دی گئی ہے جو بکریوں کو ہنکار رہا ہے نہ کہ خود بکریوں سے‘ تو پھر آیت کو کیسے سمجھا جائے گا؟

جواب یہ ہے کہ کلام میں ایجاز کے لیے بعض دفعہ اس چیز کو حذف کر دیا جاتا ہے جو سیاق وسباق سے سمجھ میں آ رہی ہو۔ اس آیت میں بھی دو چیزوں کی طرف بطور تشبیہہ اشارہ کیا گیا ہے لیکن ایک چیز کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ہم اپنی بات کی وضاحت اس شعر سے کرتے ہیں:

وانّی لَیَعْرُونی لِذِکْرِكِ فَتْرَۃٌ   کَمَا انْتَفَضَ الْعُصْفُورُ بَلَّلَّهُ الْقَطْرُ

’’مجھے تمہاری یاد آنے پر ایسی لرزش طاری ہوتی ہے جیسے کہ وہ چڑیا جس پر بارش کے قطرے گرے تو وہ لرز اٹھی۔‘‘

ظاہر میں تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے اپنے جسم کی لرزش کو چڑیا کی لرزش سے تشبیہہ دی ہے‘ لیکن اس کی مراد یہ نہیں ہے‘ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی یاد آنے پر اسے جو کپکپاہٹ ہوتی ہے وہ اس کپکپاہٹ سے ملتی جلتی ہے جو چڑیا پر بارش کے قطرے گرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ گویا یہاں دو چیزیں ہیں:

شاعر پر وہی کیفیت کا طاری ہونا جو چڑیا پر طاری ہوتی ہے (یعنی محبوب کی یاد بمقابل چڑیا پر بارش کے قطرے کا گرنا) اور پھر شاعر پر لرزش کا طاری ہونا جو چڑیا پر بھی طاری ہوتی ہے۔

سیبویہ نے بھی اسی مفہوم کے مطابق کہا: کفار کو چرواہے سے تشبیہہ نہیں دی جارہی بلکہ ان جانوروں سے تشبیہہ دی جارہی ہے جن کے اوپر چلّایا جارہا ہے۔

گویا بات یوں ہوئی کہ تمہاری اور کافروں کی مثال ایسے ہے جیسے چرواہے کی اور ان جانوروں کی جن پر چلّایا جارہا ہے' لیکن ایجاز واختصار کی خاطر یہاں اس چیز کو حذف کر دیا گیا جو مخاطب کے علم میں بآسانی آسکتی ہے۔

اب آپ یہاں یہ سوال کریں گے کہ اس آیت کا اعراب کیسے ہوگا؟

تو جواباً کہوں گا کہ قریب ترین حل یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں مضاف کو محذوف مانا جائے' یعنی **وَمَثَلُ دَاعِی الَّذِین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یَسْمَع** ''اُس شخص کی مثال جو کفار کو دعوت دے رہا ہے اس شخص جیسی ہے جو ایسی آواز لگاتا ہے جو سنائی نہیں دیتی''۔ اکثر لوگوں کے نزدیک یہی تقدیر اعراب مناسب معلوم ہوتی ہے' اور آپ چاہیں تو ہماری وضاحت کو قبول فرمائیں' جس میں معنی اور اعراب دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے' اور جسے ہمارے اکثر شیوخ اور متقدمین نے اختیار کیا ہے۔

(۸) آیت ۲۳:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝۲۳﴾

''اور اگر تم واقعتاً شک میں ہو اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر (کہ یہ ہمارا نازل کردہ ہے یا نہیں) تو لے آؤ ایک ہی سورت اِس جیسی۔ اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

اور سورۂ یونس' آیت ۳۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝۳۸ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ۝۳۹﴾

''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو پیغمبرؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ آپؐ (ان سے) کہیے کہ لے آؤ تم بھی ایک سورت اس جیسی اور (اس کے لیے) بلا لو جس کو بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔ (نہیں) بلکہ انہوں نے تکذیب کی ہے اس چیز کی جس کے علم کا یہ احاطہ نہیں کر سکے اور ابھی نہیں آئی ان کے پاس اس کی تاویل۔ اسی طرح جھٹلایا تھا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے' تو دیکھو کیسا انجام ہوا ظالموں کا!''

اور سورۂ ہود' آیت ۱۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝۱۳﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) اُس نے خود گھڑ لیا ہے۔ آپؐ کہیے کہ اچھا تم لوگ بھی لے آؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی اور (اس کے لیے) بلا لو تم جس کو بھی بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔''

یہاں چار سوال اٹھتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں ''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کہا اور باقی دونوں آیات میں صرف ''مِثْلِهٖ''

(۲) پہلی دونوں آیات میں ایک سورت لانے کا چیلنج ہے' لیکن سورۂ ہود میں دس سورتوں کا۔

(۳) سورۂ ہود کی آیت میں دس سورتوں کے ساتھ ''مُفْتَرَيٰتٍ'' کا اضافہ ہے۔

(۴) سورۃ البقرۃ کی آیت میں ''وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ'' کہا گیا اور باقی دونوں آیات میں ''وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ'' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر منکرین کو وہ چیز دکھانا مقصود ہے جس سے ان کا شک دور ہو سکے' گویا یوں کہا جا رہا ہے:

اگر تم لوگ نبی ﷺ کی نبوت میں شک کرتے ہو کہ ہم نے صرف اسے ہی کیوں چنا ہے' تو پھر کوئی دوسرا ایسا آدمی لے کر آؤ جو ایسی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دے جیسی کہ تم محمد ﷺ سے سنتے ہو' اور ایسے گواہ لے کر آؤ کہ اہلِ عرب میں کوئی دوسرا شخص ایسا بھی ہے جس سے ایسا ہی کلام صادر ہوتا ہو یا وہ ایک ایسی سورت لانے پر قادر ہو جیسی محمد ﷺ سے سنی گئی ہے' اور اگر تم ایسا کرنے سے عاجز رہو' حالانکہ خِلْقت اور کلام کو پہچاننے کے لحاظ سے تم لوگوں میں مماثلت پائی جاتی ہے چونکہ زبان وہی زبان ہے جو تمہاری جانی پہچانی ہے اور پھر بھی تم عاجز رہو — اور تمہیں عاجز رہنا پڑے گا — تو پھر اس آگ سے بچنے کا سامان کر لو جس سے وہ تمہیں تمہاری کذب بیانی کی بنا پر ڈرا رہا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہاں ''مِنْ'' کا آنا ضروری تھا جو تبعیض (یعنی ''بعض'' پر دلالت کرنے والا) کے لیے لایا جاتا ہے۔ اور سورۂ یونس میں جب شروع ہی میں کہہ دیا: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ﴾ ''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اُس نے خود وضع کیا ہے؟'' تو گویا ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر یہ قرآن بقول تمہارے بناوٹی ہے تو پھر اس جیسا کلام لانے میں تمہیں کیا رکاوٹ ہے؟ تو پھر لاؤ ایسی ایک سورت جو قرآن جیسی ہو! تو یہاں قرآن کے مماثل کلام لانے کی نفی ہو رہی ہے تاکہ ان کے عاجز ہو جانے کی صورت میں ان پر حجت قائم ہو جائے۔ جبکہ سورۃ البقرۃ میں ایسے شخص کی نفی کی جا رہی ہے کہ جس سے ایسا کلام سنا جو نبی ﷺ کے لائے ہوئے کلام کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مماثل ہو۔ یوں دونوں سورتوں کے مقصد میں اختلاف ہے' لیکن **تعجیز** (عاجز کر دینے) کے اعتبار سے دونوں میں اتحاد ہے۔ اور اس اختلافِ مقصد کی بنا پر سورۃ البقرۃ کی آیت میں ''مِنْ'' کا اضافہ ضروری تھا تاکہ معنی مقصود حاصل ہو سکے اور سورۂ یونس کی آیت میں چونکہ بغیر ''مِنْ'' کے معنی واضح تھا اس لیے ''مِنْ'' لانے کی ضرورت نہ تھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اگر سورۂ یونس میں بھی ''مِنْ'' ہوتا تو یہی مطلب حاصل ہوتا تو پھر ''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کیوں نہ کہا گیا؟

میں عرض کروں گا کہ اگر یہ مطلب ''مِنْ'' کے لانے یا نہ لانے دونوں صورتوں میں ادا ہوسکتا ہے تو پھر ایجاز کا تقاضا ہے کہ اسے نہ لایا جائے' لیکن سورۃ البقرۃ میں ''مِنْ'' کے لائے بغیر مطلب واضح نہیں ہوتا تھا اس لیے وہاں ''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کہا گیا۔ یعنی ہر صورت میں صورت حال کے مطابق بات کہی گئی۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب سورۂ ہود میں دس بناوٹی سورتوں (بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ) کے لانے کا چیلنج دیا گیا تو بناوٹی کہہ کر چیلنج کو وسیع کر دیا کیونکہ بناوٹی بات بنانا زیادہ آسان ہوتی ہے' اور اس وسعت کی بنا پر عدد میں بھی وسعت کو اختیار کیا گیا۔ باقی دونوں سورتوں میں بناوٹی سورت لانے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ سورت کے مماثل سورت لانے کا چیلنج دیا گیا تھا اور یہ چیز ان عربوں کے لیے زیادہ مشکل تھی۔ بہرصورت وہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے' لیکن اس کی نوعیت تنگی اور وسعت کے اعتبار سے تھی' جہاں تنگی تھی وہاں ایک سورت لانے کا مطالبہ کیا گیا اور جہاں وسعت تھی وہاں دس سورتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا۔ بعض مفسرین نے یہی بات لکھی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دس سورتوں کے ساتھ بناوٹی ہونے کا وصف اس لیے لایا گیا تاکہ ان کا عاجز ہونا ہر طرح سے ثابت ہو سکے۔ یعنی پہلے تو یہ چیلنج دیا گیا کہ کیا ان کے پاس ایسا کوئی شخص ہے جس کے پاس ایسا ہی کلام ہو جیسے محمد ﷺ سے سنا گیا ہے؟ یعنی کوئی ایک سورت بھی ایسی وہ لا سکتے ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ نے پڑھ کر سنائی ہے؟ اور پھر دوسرا چیلنج یہ دیا کہ تمہیں اور چھوٹ دیتے ہیں' کوئی بناوٹی کلام ہی لا کر دکھا دو! اور ان کے عاجز ہونے کی صورت میں واضح ہو گیا کہ وہ صرف عناد کی بنا پر قرآن کی حقانیت کو قبول نہیں کر رہے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں ''وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ'' کہا گیا' یعنی ایسا کوئی گواہ لے کر آؤ جو اس بات کی گواہی دے کہ اہل عرب میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس سے ویسا ہی کلام سنا گیا ہو جیسے محمد ﷺ سے سنا گیا۔ صرف دعویٰ کرنا کافی نہ ہوگا بلکہ ایسا کوئی گواہ پیش کرنا ضروری ہوگا۔

سورۂ یونس میں یوں کہا گیا کہ قرآن کی سورتوں جیسی ایک سورت لا کر دکھاؤ اور اس کام پر جو تمہاری مدد کر سکے اس کی مدد حاصل کرو۔ یہاں گواہ کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ صرف اتنا کہا گیا کہ ایسے کلام کی تالیف و ترتیب کے لیے اگر تم مدد کے طلب گار ہو تو مدد لے سکتے ہو۔ کیونکہ اگر وہ خود قرآن کی سورت جیسی سورت تالیف کر سکتے تو پھر اس کے ساتھ گواہ لانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ ہاں اگر وہ یہ کہتے کہ اہل عرب میں اس قسم کا کلام سنا گیا ہے تو پھر ان کا محض دعویٰ کافی نہ تھا بلکہ اس پر گواہ لانا ضروری تھا۔

سورۃ الانفال میں ان کا اس طرح کا دعویٰ نقل کیا گیا ہے:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣١﴾﴾

''اور جب ان پر ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم نے سن لیا' ہم چاہیں تو ایسی ہی بات ہم بھی کہہ سکتے ہیں' یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

اس اعتبار سے آیت سورۂ ہود اور سورۂ یونس ایک جیسی ہیں۔

(۹) آیت ۳۵:

﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (آیت ۳۵)

''اور ہم نے کہا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو۔ مگر اس درخت کے قریب مت جانا۔''

اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾

''اور (پھر ہم نے آدم سے کہا کہ) اے آدمؑ رہو جنت میں تم اور تمہاری بیوی' اور کھاؤ پیو اس میں سے جہاں سے تم دونوں چاہو' اور (ہاں) اس درخت کے قریب مت جانا۔''

یہاں دو سوال اٹھتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں جہاں کھانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس سے قبل ''واو النسق'' ہے' جس کا مطلب ہے کہ یہاں مختلف چیزوں میں ترتیب کا ہونا ضروری نہیں ہے' اِلا یہ کہ ترتیب کسی دوسرے وجہ سے سمجھی جائے۔ لیکن سورۃ الاعراف میں حرف فاء لایا گیا جس سے ترتیب لازمی سمجھی جاتی ہے' یعنی یہ بات پہلی بات کے بعد میں ہونے والی ہے —— سوال یہ ہے کہ جب قصہ ایک ہی ہے تو یہ اختلاف کیوں؟

(۲) سورۃ البقرۃ میں کھانے کے بعد (رَغَدًا) کہا گیا لیکن سورۃ الاعراف میں یہ لفظ نہیں کہا گیا حالانکہ قصہ ایک ہی ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں ہم عرض کریں گے (اور اللہ بہتر جانتے ہیں) کہ دونوں آیتوں کا سیاق وسباق مختلف ہے۔ سورۃ البقرۃ میں صرف یہ مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وہ واقعات بتائے جائیں جن کا تعلق قصۂ آدم سے ہے' جیسے ان کی ابتداءِ پیدائش کیسے ہوئی؟ فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ انہیں سجدہ کریں' ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا' پھر آدم کو جنت میں رہنے اور کھانے کا حکم دیا گیا۔ ان تمام باتوں کا بغیر کسی زمانی ترتیب کے بیان مقصود تھا' اس لیے یہاں بجائے حرف فاء کے حرف واؤ لایا گیا۔ لیکن سورۃ الاعراف کی آیت میں آدم علیہ السلام اور ان کی نسل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان مقصود ہے۔ دیکھئے قصہ آدم سے پہلے ذکر کیا گیا:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰﴾

''اور ہم نے تمہیں زمین میں تمکین عطا کی اور وہاں تمہارے لیے معیشت بنائی۔ تم شکر کرتے ہو لیکن بہت تھوڑا۔''

اس کے بعد انسان کی تخلیق اور تصویر کا ذکر ہے' پھر فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا ذکر ہے' آدم کو سجدہ نہ کرنے پر اس کی حجت بازی کا ذکر ہے اور پھر صرف ابلیس کو دھتکارنے کا تذکرہ ہے:

﴿قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ﴾ (آیت ۱۸)

''کہا کہ یہاں سے نکل جا حقیر اور دھتکارا ہوا۔''

اور پھر شیطان کے آدمؑ کو بہلانے' پھسلانے' آدمؑ کے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے' آدمؑ کا اپنی خطا کا اعتراف کرنے اور بالآخر اللہ کا آدمؑ کو زمین پر اتر جانے کا حکم ہے' اور پھر آدمؑ کو شیطان کے پھندوں سے بچنے کے لیے ان الفاظ سے تنبیہہ کی گئی:

﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ﴾ (آیت ۲۷)

''اے بنی آدم! کہیں شیطان تمہیں ایسے نہ بہکا دے جیسے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا۔''

یعنی یہاں ترتیب مقصود تھی اس لیے حرف ''فاء'' کو لایا گیا جس سے ترتیب لازم ہے' حرف ''واوٗ'' نہیں لایا گیا جو صرف مختلف باتوں کو اکٹھا بیان کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ یہاں ایک کے بعد دوسری نعمت کا بیان مقصود تھا جبکہ سورۃ البقرۃ میں صرف واقعات کا بتانا مقصود تھا اور اسی اعتبار سے دونوں آیتوں میں یہ اختلاف واقع ہوا' واللہ اعلم!

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ سورۃ البقرۃ میں لفظ ''رَغَدًا'' کا ذکر ہوا اور سورۃ الاعراف میں اسے حذف کر دیا گیا تو وہ اس وجہ سے کہ یہاں پہلے ''مِنْ'' کا ذکر ہے (مِنْهَا یعنی جنت میں سے) اب چونکہ ''مِنْ'' تبعیض کے لیے استعمال ہوتا ہے' (یعنی کچھ کے معنی میں) تو یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ کچھ کچھ کھانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی کم کھاؤ' بہت کچھ نہ کھاؤ' حالانکہ ایسا مطلوب نہ تھا۔ تبعیض سے مراد ہے کہ جنت میں اتنا کچھ ہے کہ جتنا بھی کھاؤ گے وہ جنت کی وسعت کے اعتبار سے ''کچھ'' ہوگا۔ جنت تو جگہ ہی ایسی ہے کہ اگر ساری اولادِ آدم بھی وہاں کھانے میں مصروف ہو تو اس کا ''کچھ'' حصہ ہی کھا سکے گی' وہاں تو ہر نعمت فراواں ہے' وہ کچھ ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل میں اس کا خیال تک نہیں آ سکا۔ اب چونکہ ''مِنْ'' کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس لیے (رَغَدًا) کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جی بھر کر کھاؤ۔

رہی سورۃ الاعراف تو اس میں چونکہ اس قسم کا شبہ واقع نہیں ہو رہا تھا اس لیے ''رَغَدًا'' کا لفظ لانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہاں پر کہا گیا ''مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا'' کھاؤ جہاں سے بھی چاہو۔ گویا کھلی چھٹی دے دی گئی کہ جہاں سے چاہو' کھاؤ۔ اب جنت وسیع بھی ہے اور طرح طرح کے میوے وہاں پر موجود ہیں' اور دعوتِ عام ہے کہ جہاں سے چاہو کھاؤ تو پھر ''رَغَدًا'' کا لفظ لانے کی ضرورت نہ رہی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سورۃ البقرۃ میں بھی تو ''حَیْثُ شِئْتُمَا'' کے الفاظ موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ سے کھانے کی اجازت ہے تو پھر ''رَغَدًا'' کا لفظ کیوں لایا گیا؟

اس کے جواب میں ہم توجہ دلائیں گے کہ دونوں عبارتوں میں فرق ہے:

''حَیْثُ شِئْتُمَا'' جہاں کہیں سے چاہو۔

اور ''مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا'' ہر اُس ثمر سے جو کہیں بھی ہو۔

پہلی آیت (مِنْ کے بغیر) سے اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ہر جگہ سے کھانے کی اجازت ہے' خاص طور پر ہر ثمر سے کھانے کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ جیسے ایک شخص سے کہا جائے:

کُلْ هٰذا العُنقودَ حیثُ شِئْتَ مِن هٰذَا الْبُستان

''یہ انگور کھاؤ جہاں چاہو اس باغ میں سے''

اور اگر یوں کہا:

كُلْ مِن حيثُ شِئْتَ مِنْ مَواضِع هٰذا البُستان

''اس باغ کی جس جگہ سے بھی چاہو کھاؤ۔''

تو اسے باغ کی ہر جگہ سے کھانے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ گویا دوسری ترکیب میں کھانے کی' بہ نسبت پہلی ترکیب کے' زیادہ وسعت ہے۔

اس مثال سے مقصود واضح ہوگیا کہ سورۃ البقرۃ میں ''رَغَدًا'' کیوں لایا گیا' اور سورۃ الاعراف میں اس کے بغیر کیوں اکتفا کیا گیا۔

(۱۰) آیت ۳۸:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى.....﴾

''ہم نے کہا کہ تم سب وہاں سے اتر آؤ' اور پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے.....''

لیکن سورۃ الاعراف کی آیت ۲۴ میں اس لفظ (اِهْبِطُوْا) کے ساتھ یہ اضافہ ہے: ﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ''تم میں سے کچھ دوسروں کے لیے آپس میں دشمن ہیں۔''

اور ایسے ہی سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۲۳ میں بھی یہ اضافہ موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں اس اضافے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پچھلی آیت (نمبر ۳۶) میں چونکہ یہ اضافہ موجود ہے: ﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ اس لیے تکرار سے بچنے کے لیے دوبارہ اس کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ طٰہٰ میں یہ آیت ایک ہی دفعہ آئی ہے اس لیے ان الفاظ کا لانا مناسب سمجھا گیا۔

(۱۱) آیت ۳۸:

﴿فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾

''اور پھر جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔''

لیکن سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۳ میں فرمایا: ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ﴾

یہاں لفظ ایک ہی ہے لیکن صیغے کا اختلاف ہے۔ یعنی تَبِعَ اور اتَّبَعَ۔

اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ دونوں الفاظ کا مطلب ایک ہے' لیکن صیغے کے اختلاف کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ''تَبِعَ'' اصل ہے اور ''اتَّبَعَ'' فرع ہے۔ تَبِعَ میں ''پیروی کرنا'' لیکن بغیر کسی غور و فکر یا ذہنی مشقت کے' اور ''اتَّبَعَ'' میں پیروی کرنا لیکن غور و فکر اور ذہنی مشقت کے ساتھ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ فطری ترتیب یہی ہو سکتی تھی کہ پہلے ''تَبِعَ'' لایا جائے جو کہ اصل ہے اور اس کے بعد ''اتَّبَعَ'' جو کہ فرع ہے۔

ایک دوسرا جواب بھی ہو سکتا ہے جو کہ اصل میں پہلے جواب کی مزید توضیح ہے اور وہ یہ کہ جیسے پہلے کہا گیا: ''اتَّبَعَ'' کے مفہوم میں غور و خوض کرنا اور ذہنی مشقت شامل ہے' اور یہ مفہوم ''تَبِعَ'' میں نہیں پایا جاتا جو کہ اصل

ہے۔ ''تَبِعَ'' سے مراد ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی بغیر کسی سوچ بچار کے پیروی کرتا چلا جائے۔ یہ دونوں الفاظ جہاں بھی استعمال ہوں گے' سیاق وسباق سے اسی مفہوم کی تائید ہوگی جو ہم نے بیان کیا ہے۔

مثال کے طور پر ابراہیم الخلیل علیہ السلام کا قول ملاحظہ فرمائیں جیسے کہ قرآن میں ارشاد ہوا:

﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ﴾ (ابراھیم:٣٦)

''جو میری پیروی کرتا ہے وہ مجھ سے ہے۔''

یہاں وہ اپنے پیروکار سے (فَاِنَّهٗ مِنِّیْ) کہہ کر انتہائی قرب کا اظہار کر رہے ہیں' یعنی وہ ایسا شخص ہے جو کھلے کھلے شواہد کی بنا پر فطری طور پر ہدایت یافتہ ہے' اسے ہدایت کے حصول میں کوئی زیادہ ذہنی مشقت پیش نہیں آئی۔ اس لیے اس کے لیے لفظ ''تَبِعَ'' ہی مناسب ہے۔ اس کے مقابلے میں گمراہ لوگوں کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (القصص:٥٠)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف سے ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کی!''

یہاں ایسے لوگ مراد ہیں جو فطرت کی آواز سے بھاگ رہے ہیں اور ان چیزوں کی طرف لپک رہے ہیں جن کی نہ کوئی دلیل ہے نہ برہان۔ یعنی فطرت سے اعراض کرنے کے لیے انہیں اچھی خاصی مشقت کرنا پڑی ہے اور اس لیے لفظ ''اتَّبَعَ'' ان کے لیے مناسب ہے۔ اور پھر ایسے ہی لوگوں کے لیے' بیع وشراء کی تصویر کشی کی گئی۔ فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ (البقرۃ:١٦)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کا سودا کیا ہے تو پھر ان کی تجارت سودمند ثابت نہیں ہوئی۔''

یہ ایسے لوگوں کی تصویر کشی ہے جن کے سامنے دلائل اور شواہد کا انبار لگا ہوا تھا' وہ خود بھی سنتے تھے' دیکھتے تھے' دل کی دولت سے مالا مال تھے لیکن انہوں نے فطرت کے دلائل کو جان بوجھ کر اور خوب غور وخوض کے بعد چھوڑا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ (الاحقاف:٢٦)

''لیکن ان کے کانوں اور آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ بھی نفع نہ پہنچایا جبکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے لگے۔''

''جَحَد'' یعنی انکار کرنا اُسی وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی ایسی معلوم چیز کا انکار کرے جو اُسے حاصل ہو چکی ہو اور پھر وہ باطل پر ڈٹا رہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے لفظ ''اتّبع'' مناسب ہے نہ کہ ''تَبِعَ''۔

ایسے ہی یہ لفظ ان نافرمانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا جو مخالفت میں حد سے بڑھ گئے ہوں۔ انہیں کہا گیا:

﴿وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الزمر:٥٥)

''اور پیروی کرو اُس بہترین چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔''

یہ لوگ چونکہ گناہوں کے عادی ہو چکے تھے اور مخالفت ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی‘ اس لیے اپنی اس حالت سے ہٹنے کے لیے انہیں مشقت اور ریاضت کی ضرورت تھی‘ اس لیے لفظ ’’اتبّعَ‘‘ لایا گیا۔

اب دیکھئے اہل ایمان کو کہا گیا: ﴿لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ﴾ (النور: ۲۱) ’’شیطان کے قدم بقدم نہ چلو‘‘۔ وہ اس لیے کہ اہل ایمان کے لیے نیکیاں کرنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ اور پھر اگر وہ بدی کی راہ پر چلیں گے تو فطرت کے اُلٹ کام کرنے کے لیے انہیں کافی محنت و مشقت برداشت کرنا ہوگی۔ اس لیے یہاں بھی لفظ ’’لَا تَتَّبِعُوْا‘‘ لایا گیا۔

اب اس وضاحت کے بعد دوبارہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ طٰہٰ کی آیات ملاحظہ فرمائیں۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے‘ جنت کے پھل رغبت سے کھانے وغیرہ کا ذکر کیا گیا اور پھر صرف اتنا کہا گیا کہ شیطان نے انہیں بہکا دیا۔ شیطان کی حجت بازی اور وسوسے کا ذکر نہیں گیا‘ اس لیے یہاں ’’فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ‘‘ کا ذکر ہوا۔ لیکن سورۃ طٰہٰ میں شیطان کے وسوسے کا تفصیلی ذکر ہے:

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝۱۲۰﴾ (طٰہٰ)

’’کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور ایسی بادشاہت بتلاؤں جو کبھی پرانی نہ ہو!‘‘

اور اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سورۃ الاعراف میں بیان کیا گیا:

﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰﴾

’’تمہارے ربّ نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔‘‘

پھر اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اس پر قسم بھی کھائی۔ اب جب سورۂ طٰہٰ میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا تو شیطان لعین کے حیلوں بہانوں کی قوت کا بھی اندازہ ہو گیا‘ اور یہ کہ وہ کیسے کیسے بنی آدم کو بہلا اور پھسلا سکتا ہے اور طاغوت کی عبادت کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور کیسے عقل کے اندھے اس کے پیچھے لگے چلے آتے ہیں۔ اور اگر ایسی صورتحال ہو تو پھر حق کو پہچاننے میں کتنی دقت اور مغز ماری کی ضرورت ہوگی۔ اس اعتبار سے سورۂ طٰہٰ میں ’’اتَّبَعَ‘‘ کا لفظ لانا اور سورۃ البقرۃ میں ’’تَبِعَ‘‘ کا لفظ لانا مناسب ٹھہرا‘ اور یہ مناسبت ہر طرح سے ہے‘ معنی و مطالب کے اعتبار سے بھی۔ اور اختصار و طوالت کے اعتبار سے بھی۔ یعنی جہاں مضمون مختصر تھا وہاں ’’تَبِعَ‘‘ ذکر کیا اور جہاں تفصیل تھی وہاں ’’اتَّبَعَ‘‘ کا ذکر ہوا۔ یہاں ترتیب کا بھی خیال رکھا گیا ہے‘ یعنی اصل کو پہلے اور اس کی فرع کو بعد میں لایا گیا۔ ’’تَبِعَ‘‘ اصل ہے جسے ابتدائی سورت (البقرۃ) میں ذکر کیا اور ’’اتَّبَعَ‘‘ فرع ہے جسے دُور کی سورت (طٰہٰ) میں بیان کیا گیا۔ اور اس طرح تینوں اعتبارات سے مناسبت ظاہر ہو گئی۔ واللہ اعلم!

(۱۲) آیت ۴۵:

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵﴾

’’اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔ یہ چیز شاق ہے مگر ڈرنے والوں پر۔‘‘

اور آیت ۱۵۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ ﴾

''صبر اور نماز سے مدد چاہو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

یہاں پر یہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں: (۱) ہر آیت کا آخری حصہ دوسری آیت سے مختلف ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟ اور (۲) کیا ایک آیت کا آخری حصہ دوسری آیت میں لگایا جا سکتا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ آیت کا تتمہ اسی آیت کے مناسب ہے جہاں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی آیت کا تتمہ ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ اس اعتبار سے ہے جس اعتبار سے یہ آیت بنی اسرائیل کے سیاق و سباق میں وارد ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل میں نماز کے بارے میں جو سستی' بوجھل پن اور اس پر مستزاد ضعفِ ایمانی اور اخلاص کی کمی کی کیفیت پائی جاتی تھی اس کی مناسبت سے یہ الفاظ لائے گئے۔ دیکھئے منافقین' جن کی اکثریت یہودیوں میں سے تھی' کے بارے میں کہا گیا:

﴿وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ (التوبۃ:۵٤)

''اور وہ نماز کو نہیں آتے مگر سست روی کے ساتھ۔''

اور یہ بھی کہا:

﴿وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى﴾ (النساء:۱٤۲)

''اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔''

تو پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے ذکر کی مناسبت سے ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ کے الفاظ لائے گئے اور دوسری آیت میں جہاں خطاب ہی اہل ایمان سے ہو رہا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ اور جہاں استقامت و رضامندی پائی جاتی ہے وہاں صبر کا ذکر کیا گیا کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنت میں حصولِ درجات کے لیے امورِ اطاعت میں صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اب ظاہر ہو گیا کہ ہر آیت کا تتمہ اس کے اپنے حال کے مناسب ہے اور ایک آیت کے تتمہ کو دوسری آیت کی جگہ نہیں لگایا جا سکتا۔ واللہ اعلم!

(۱۳) آیت ۴۸:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾

''اُس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا اور نہ کوئی سفارش قبول ہو گی اور نہ کوئی فدیہ لیا جائے گا۔''

پھر آیت ۱۲۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾

''اُس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا' نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا' نہ اُسے کوئی شفاعت نفع دے گی۔''

پہلی آیت میں شفاعت (سفارش) کا ذکر پہلے کیا گیا اور دوسری آیت میں اسے مؤخر کر دیا گیا' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی توجیہہ یوں ہوسکتی ہے کہ پہلی آیت سے قبل یہود کو مخاطب کر کے کہا گیا:

﴿اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ (آیت ۴۴)

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔''

یہاں وہ لوگ جن کو نیکی کی تلقین کی گئی ہے، عین ممکن ہے کہ وہ نیکی کی راہ اختیار کر کے نافرمانی سے بچ جائیں اور اس طرح نجات پا جائیں، یعنی انہیں تو حکم دینے والوں کی بنا پر ہدایت حاصل ہوگئی، گو حکم دینے والے خود اس نیکی پر عمل پیرا نہ ہو سکے، اور پھر قیامت کے دن جب یہ حکم دینے والے اپنی بدعملی کی بنا پر گرفتارِ مصیبت ہوں گے تو کسی کا سہارا ڈھونڈیں گے اور ایسے وقت میں ان کی نگاہیں ان لوگوں کی طرف ہوں گی جو ان کی وجہ سے راہ یاب ہوئے، شاید کہ وہ ان کے کام آ جائیں، شاید کہ وہ ان کی سفارش کر سکیں۔

اسی طرح کی بات منافقین کے ضمن میں بھی کہی گئی کہ قیامت کے دن وہ قیامت کی ہولناکیوں سے نجات پانے کے لیے اہل ایمان کے ساتھ اپنی معیت کا سہارا ڈھونڈیں گے، کہیں گے: ﴿اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ﴾ (النساء: ۱۴۱) ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' تو اگر منافقین اپنی نجات کے لیے مؤمنین کی معیت کا واسطہ دے سکتے ہیں تو وہ لوگ جو نیکی کا حکم دیتے رہے تھے اور اس حکم کی بنا پر کچھ لوگوں کو ہدایت نصیب ہوئی تھی تو انہیں تو ان ہدایت یافتہ لوگوں سے زیادہ اُمید ہوگی کہ آج وہ ان کے کچھ کام آ سکیں گے، شاید ان کی سفارش کر سکیں گے۔ اس لیے یہاں اس بات کا موقع تھا کہ پہلے سفارش کی نفی کی جاتی کہ آج کے دن خالص ایمان ہی کام آئے گا، سفارش کام نہ آئے گی۔

دوسری آیت سے پہلے چونکہ اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس لیے فدیہ کا ذکر پہلے کیا گیا کہ کسی مصیبت سے نجات پانے کے لیے زرِ فدیہ دے کر جان چھڑانا دنیا میں ایک معروف عمل رہا ہے اس لیے اس کا پہلے ذکر کیا جانا ہی مناسب تھا۔ واللہ اعلم (۱)

(۱۴) آیت ۴۹:

﴿وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ﴾

''اور جب ہم نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے، جو تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔''

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴۱)

''اور وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے تمہیں آلِ فرعون سے بچا لیا جو تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے، تمہارے

---

(۱) مؤلف کی عبارت یہاں بہت گنجلک ہے اس لیے ساری عبارت کا سادہ مفہوم بیان کر دیا گیا ہے۔

بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔''

دونوں سورتوں میں مضمون ایک ہی بیان ہوا ہے لیکن سورۃ البقرۃ میں لفظ نَجَّيْنٰكُمْ (صیغہ مضاعف) اور سورۃ الاعراف میں ''اَنْجَيْنٰكُمْ'' (غیر مضاعف) لایا گیا۔ اور اوّل الذکر میں يُذَبِّحُوْنَ اور آخر الذکر میں ''يُقَتِّلُوْنَ'' ہے۔

ایک تیسری آیت یعنی سورۂ ابراہیم کی آیت ۶ میں ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ﴾ کہا گیا ہے۔ یہاں يُذَبِّحُوْن سے قبل واو العطف لایا گیا جو کہ پہلی دونوں سورتوں میں نہیں ہے۔ اس طرح یہاں تین سوال وارد ہوتے ہیں۔ صاحب ''دُرّة التنزيل وغرة التاويل'' (الاسکافی) نے ان میں سے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے' یعنی يُذَبِّحُوْنَ اور ''يُقَتِّلُوْنَ'' کے مابین فرق کا اور سورۂ ابراہیم میں واو العطف لانے کا' لیکن تیسری چیز سے تعرض نہیں کیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل پر کی گئی بے شمار نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر ان کی ناشکری دکھا کر ان کے بداعمال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ہم بطور تمہید عرض کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کرنے سے پہلے ازل میں انہیں وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں جو ان کی خلقت سے پہلے ان کے لیے مہیا کر دی گئی تھیں۔ اور یہ کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعزاز واکرام سے نوازا اور یہ کہ اس کی رحمت' اس کے غیظ وغضب پر سبقت لے گئی ہے اور یہ کہ وہی تمام احسانات وفیضانات کا منبع ہے اور پھر ان نعمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں۔ اسی لیے قرآن کریم کی ابتداء ہی میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اِلٰى قولهٖ تعالىٰ :

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (البقرة:۲۱-۲۲)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ انہیں کیسے عدم سے وجود میں لایا گیا' پھر زمین کو ان کے لیے بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا' پھر آسمان سے پانی برسا کر ان کے لیے پھل مہیا کیے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر یہ سارے احسانات کیے' حالانکہ اسے ایسا کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی' اور پھر انہیں اسی کی عبادت کرنے کی طرف بلایا۔ یہی بات تمام رسولوں سے بھی کہی گئی۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا:

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ﴾ (ابراهيم:۵)

''اور انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ'' یعنی اس کی نعمتیں اور احسانات۔

اور اسی انداز میں بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا۔ یعنی نعمتیں یاد دلانے کے بعد اللہ کی عبادت کی طرف بلانا' رسول کی تصدیق کرنا اور ایمان پر عہد ومیثاق لینا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ (آیت ۴۷)

''اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی تھی۔''

تمہارے اجمالی ذکر کیا اور اس کے بعد تفصیل سے بتایا کہ کیسے تمہیں سمندر پھاڑ کر آلِ فرعون سے نجات دلائی اور

کیسے تمہارے دشمن کو غرق کیا۔ پھر انہیں یاد دلایا کہ باوجود یکہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی' ان کی توبہ کو قبول کیا' انہیں معاف کیا اور جب ان کے مطالبہ رؤیت باری تعالیٰ کے نتیجہ میں ان پر موت طاری کی گئی تو پھر دوبارہ انہیں زندہ کیا گیا' اور پھر جب وہ سخت دھوپ کی شکایت کر رہے تھے تو ان پر بادلوں کا سایہ کیا۔ اب ملاحظہ کریں کہ لفظ ''نَجَّيْنَاكُمْ'' صیغہ تضعیف کے ساتھ لانا کتنا برمحل ہے' ان بے شمار نعمتوں کے بیان کے بعد جو انہیں عناد و مخالفت سے روکنے کے لیے یاد دلائی گئیں۔ اور اگر یہاں صرف ''اَنْجَيْنَاكُمْ'' کہا جاتا تو سیاق وسباق کے ساتھ اس کی مناسبت نہ ہوتی۔ اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ ''نَجَّيْنَاكُمْ'' (صیغہ تضعیف کے ساتھ) اگلے لفظ يُذَبِّحُوْنَ سے بھی مناسبت رکھتا ہے کہ وہ بھی صیغہ تضعیف کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یہاں لفظ ''اَنْجَيْنَاكُمْ'' (بغیر صیغہ تضعیف) کسی طرح بھی مناسب نہ تھا' نہ ہی سیاقِ کلام کے اعتبار سے اور نہ ہی معنی کے اعتبار سے۔

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ''ذبح'' کا لفظ ''قتل'' کی صفت کو بیان کر رہا ہے' کیونکہ قتل تو صرف زندگی کو قاتل کے ہاتھ سے ختم کرنے کا نام ہے' اور ''ذبح'' اس کیفیت کا نام ہے جس سے یہ قتل واقع ہوا۔ یہاں ایجاز و اختصار مقصود تھا۔ اگر ''قتل'' کا بھی ذکر ہوتا اور اس کے بعد ذبح کا' تو پھر ایجاز کہاں رہا؟ ''يُذَبِّحُوْنَ'' کہہ کر مقصود واضح ہو گیا۔ اب چونکہ سورۃ البقرۃ میں صفت قتل کا بیان ہو چکا تو سورۃ الاعراف میں' جہاں ان ساری نعمتوں کا بیان نہیں ہوا' صرف ''قتل'' کا بیان ہوا۔ یعنی دونوں سورتوں میں جو لفظ مناسب تھا وہی لایا گیا۔ واللہ اعلم!

تیسرا سوال یہ تھا کہ برخلاف سورۃ البقرۃ اور سورۃ الاعراف' سورۂ ابراہیم میں يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کے بعد واو العطف لایا گیا اور کہا گیا: ﴿وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ﴾۔ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس سورت میں چند رسولوں کا بیان ہوا ہے' لیکن انتہائی اجمال اور اختصار کے ساتھ۔ یہاں وہ تفصیل بیان نہیں کی گئی جو دوسری سورتوں میں بیان کی گئی۔ یہ دو طرح کے اسلوب ہیں جو عربوں میں بھی خوب معروف و مشہور ہیں۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے: ؎

يَرْمُوْنَ بِالْخُطُب الطِوَال و تارةً وَحْيَ الْملاحِظِ خِيفَةَ الرُقباء

''کبھی تو لمبے لمبے خطبوں سے چاند ماری کرتے ہیں اور کبھی رقیبوں کے ڈر سے آنکھوں کے اشاروں ہی سے کام لے لیتے ہیں۔''

کتاب الٰہی میں بھی یہ دونوں اسلوب نمایاں ہیں۔ دیکھئے کہ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں پانچ اقوام یعنی قومِ نوح' قومِ ہود' قومِ صالح' قومِ لوط اور قومِ موسیٰ علیہم السلام کے قصے بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں' لیکن یہی پانچ قصے سورۃ القمر میں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ سورۂ ابراہیم میں بھی ایجاز و اختصار کا اسلوب اپنایا گیا۔

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (آیت ۹)

''کیا تمہارے پاس نہیں آ چکی ہیں خبریں ان لوگوں کی جو تم سے پہلے تھے' یعنی قومِ نوح اور عاد اور ثمود!''

اور پھر آیت ۱۴ تک یہ سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایجاز کے ساتھ وعید کا بھی ذکر ہے۔

ان آیات سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ان دونوں اغراض (ایجاز اور وعید) کا خیال رکھا گیا ہے۔شروع میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۶)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر کی ہے جب اُس نے تمہیں نجات دی آلِ فرعون سے' وہ تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے' اور وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر رہے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔''

اب دیکھئے کہ صرف ایک جملے ''يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ'' سے اُن تمام تکالیف کی طرف اشارہ ہو گیا جو آل فرعون نے بنی اسرائیل کے لیے روا رکھی تھیں' یعنی بیگار میں لگایا جانا' مشقت آمیز کاموں میں لگانا' انہیں ذلیل کرنا' بیٹوں کو قتل کرنا' عورتوں کو باقی رکھنا وغیرہ۔

اور پھر ان تمام تکالیف میں سب سے تکلیف دہ چیز کو خاص طور پر بیان کیا گیا یعنی بیٹوں کا ذبح کرنا۔ گو وہ ''بدترین عذاب'' میں شامل تھا لیکن اس کی شدت اور شناعت کی بنا پر خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک عام چیز کو پہلے بیان کیا جائے اور پھر ان تمام عام چیزوں میں سے ایک چیز کا بطور خاص بیان کیا جائے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو' فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ (البقرۃ:۹۸)

''اور جو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا دشمن ہے''

پھر خاص طور پر دو فرشتوں کا ذکر فرمایا: ﴿وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ﴾ ''اور جبرائیل اور میکائیل کا'' —— یہ دونوں بحیثیت عمومی تمام فرشتوں میں داخل تھے لیکن ان کی قدر و منزلت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر ان کا الگ سے ذکر کیا گیا۔

یہی بات ہے جسے ہم سورۂ ابراہیم میں دکھانا چاہتے ہیں۔اب ایک آخری بات کہ سورۃ البقرۃ میں وارد ﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ﴾ کا اعراب کیا ہو گا تو اسے پچھلے فعل کا بدل بھی قرار دیا جا سکتا ہے یا اسے استیناف (کلام کو دوبارہ شروع کرنا) بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ بدترین عذاب کیا تھا؟ تو جواباً کہا گیا: وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کیا کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک استیناف قرار دینا زیادہ بہتر ہے' اور باقی آیتوں میں پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

(۱۵) آیت ۵۸۔۵۹:

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۵۹﴾

''اور جب ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور حِطَّةٌ (ہمارے گناہ معاف کر دے) کہو' ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ عطا کریں گے۔ پھر ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل ڈالا تو ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔''

اور سورۃ الاعراف (آیت ۱۶۱۔۱۶۲) میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيٰٓئٰتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾

''اور جب ان سے کہا گیا کہ تم اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس جگہ سے جہاں تمہیں رغبت ہو اور کہو حِطَّة (ہمارے گناہ معاف کر دے) اور سجدہ کرتے ہوئے دروازے سے داخل ہو' ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے' جو لوگ نیک کام کریں گے انہیں ہم اور زیادہ عطا کریں گے۔ سو بدل ڈالا ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی تو ہم نے آسمان سے ایک آفت ان پر بھیجی' اس وجہ سے کہ وہ ظلم کر رہے تھے۔''

یہاں دس سوال وارد ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں ﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا﴾ اور سورۃ الاعراف میں ﴿وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا﴾ ارشاد فرمایا۔

(۲) البقرۃ میں ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا﴾ اور الاعراف میں ﴿وَكُلُوْا﴾

(۳) البقرۃ میں ﴿رَغَدًا﴾ اور الاعراف میں یہ لفظ موجود نہیں۔

(۴) البقرۃ میں ﴿ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ اور الاعراف میں ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾

(۵) البقرۃ میں ﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ﴾ اور الاعراف میں جمہور (ماسوائے ابی عمر اور ابن عامر) کی قراءت کے مطابق ﴿خَطِيْٓئَاتِكُمْ﴾ جو کہ جمع سالم ہے۔

(۶) البقرۃ میں ﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور الاعراف میں ﴿سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(۷) الاعراف میں ﴿مِنْهُمْ﴾ کا اضافہ جو کہ البقرۃ میں نہیں ہے۔

(۸) البقرۃ میں ﴿فَاَنْزَلْنَا﴾ جبکہ الاعراف میں ﴿فَاَرْسَلْنَا﴾

(۹) البقرۃ میں ﴿عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ اور الاعراف میں صرف ﴿عَلَيْهِمْ﴾

(۱۰) البقرۃ میں ﴿بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ اور الاعراف ﴿بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ﴾

اب ان کے جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) شہر میں داخل ہونے کا حکم اور وہاں بسنے کا حکم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ گو بعد میں جو باتیں بیان ہوئیں ان

سے شہر میں داخل ہونے کے ساتھ وہاں رہنے کا بھی اشارہ ملتا ہے' لیکن یہ ''داخل ہونے'' کے مفہوم میں صریح طور پر شامل نہیں ہے۔ الاعراف کی آیت نے اس اشارے کو کھول دیا اور وہاں داخل ہونے کی غرض وغایت کو واضح کر دیا اور اس طرح دونوں مقامات سے پوری طرح بات واضح ہوگئی۔

(۲) ''فَكُلُوْا'' میں فاء' تعقیب کے لیے ہے یعنی پہلے دخول ہوگا اور اس کے بعد ہی کھانا پینا ہوسکتا ہے' جو نہ ہی دخول سے پہلے ہوسکتا ہے اور نہ ہی دخول کے ساتھ ساتھ بلکہ معاً بعد میں ہوگا۔ اس لیے یہاں حرف ''فاء'' کا لانا بالکل مناسب تھا۔ سورۃ الاعراف میں حرف ''واؤ'' لایا گیا کہ اس سے قبل ''سکونت'' کا حکم دیا گیا تھا۔ کھانا پینا سکونت اور معیشت کے لوازم میں سے ہے لیکن اس کے فوراً بعد ہونے کے لیے لازم نہیں ہے۔ اس لیے یہاں ''واؤ'' کا لانا ہی بہتر تھا۔

(۳) سورۃ البقرۃ کھانے کے ساتھ ''رَغَدًا'' یعنی ''خوب فراوانی کے ساتھ'' کا لفظ لایا گیا جبکہ الاعراف میں یہ لفظ موجود نہیں۔ اور یہ اس لیے کہ سورۃ البقرۃ کے سیاق میں ایسی کوئی بات نہیں بیان ہوئی جس سے ''رَغَدًا'' کا مفہوم خود بخود ظاہر ہوتا ہو' لیکن سورۃ الاعراف میں جہاں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا' یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں انسان اقامت اختیار کرے گا وہاں کھانا پینا بھی ہوگا اور فراوانی کے ساتھ ہوگا' اور چونکہ یہاں ان پر انعامات اور احسانات کا تذکرہ بھی مقصود ہے اس لیے ''رَغَدًا'' کو علیحدہ سے ذکر کرنے کی حاجت نہیں تھی۔ سیاقِ آیات (یعنی جہاں اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے) کا بھی تقاضا ہے کہ یہاں رزق کی فراوانی ہی مراد ہوسکتی ہے نہ کہ تنگی اور قلت۔

(۴) اب رہا سورۃ البقرۃ میں یہ کہنا ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ اور پھر ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ اور سورۃ الاعراف میں اس کا الٹ بیان کیا جانا تو اس کی توجیہہ یوں ہوسکتی ہے (اور اللہ بہتر جانتے ہیں) کہ ان سے حالت سجود میں حِطَّةٌ کے الفاظ سے ایک دعا کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگر یہ عبارت دونوں سورتوں میں یکساں ہوتی تو چونکہ ''واؤ'' سے ترتیب کا ہونا لازم نہیں ہے اس لیے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ دونوں اوامر یعنی سجدہ کرنا اور مغفرت کی دعا کرنا علیحدہ علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن دونوں سورتوں میں تقدیم وتاخیر کی بنا پر یہ واضح ہوگیا کہ یہ دعائیہ الفاظ حالت سجود میں مطلوب ہیں' نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد' یعنی یہاں ''واؤ'' معیت کے معنی میں ہے۔ سورۃ البقرۃ میں حالت سجود کا پہلے ذکر ہے اور دعا کا بعد میں' اور یہی فطری ترتیب ہے کہ پہلے انسان سجدہ کے لیے جھکے اور پھر اس کی زبان پر الفاظِ دعا جاری ہوں۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہوسکتی ہے کہ فصحاء عرب کے نزدیک اگر دو حکم ساتھ ساتھ مطلوب ہوں اور دونوں کے درمیان واو العطف کو لایا جائے کہ جس سے ترتیب لازم نہیں ہوتی' پھر بھی وہ پہلے زیادہ اہم شے کا ذکر کریں گے۔ سیبویہ کہتے ہیں کہ ایسے سیاق میں جہاں دو حکم ساتھ ساتھ مطلوب ہوں وہاں پہلے اُس حکم کو بیان کیا جائے گا جو زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (البقرۃ:۴۳)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔''

اہل ایمان سے یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں لیکن زیادہ اہم چیز کا پہلے ذکر کیا گیا۔ نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (آل عمران:۱۳۲)

''اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔''

اور ارشاد فرمایا:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (النساء:۱۳۶)

''اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔''

مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ﴾ (التوبۃ:۶۲)

''اللہ اور اس کا رسول رضامند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔''

اور اس طرح کی بے شمار آیات ہیں' لیکن اس کا اُلٹ ذکر کیا جانا فصیح نہیں قرار دیا جائے گا۔ اور اس وضاحت کی روشنی میں سورۃ البقرۃ میں پہلے سجود کا اور پھر دعا (حِطَّۃٌ) کا ذکر سمجھ میں آ جاتا ہے' گو دونوں آیات کے مجموعی ذکر سے ان دونوں احکامات کا ساتھ ساتھ ہونا بھی لازم قرار پاتا ہے۔ واللہ اعلم!

(۵) دونوں سورتوں میں لفظ **خطیئۃ** کی جمع ہے جو سورۃ البقرۃ میں **فعائل** کے وزن پر جمع تکسیر کے صیغے کے مطابق وارد ہوئی ہے۔ **فعائل** کا وزن جیسے **طعینۃ** اور **طعائنُ** **سفینۃ** اور **سفائنُ** **صحیفۃ** اور **صحائف**' ایسے ہی **خطیئۃ** سے **خطایئ** بنے گا' جو پھر تصریف کے قاعدے کے مطابق **خطایا** کی صورت اختیار کر لے گا ' جیسے **مطیّۃ** کی جمع **مطایا** ہے۔ سورۃ البقرۃ میں جمع تکسیر لائی گئی' اس لیے کہ اس سورت میں کثرت سے نعمتوں کا بیان ہوا ہے اور ان کے مقابلے میں پھر **خطیئۃ** کی جمع تکسیر سے ان کی خطاؤں کی کثرت کی طرف اشارہ ہو گیا' کیونکہ جموع تکسیر سوائے چار اوزان کے (یعنی **أفعُلٌ** ' **اِفعال** ' **افْعِلۃ**' **فِعْلۃ**) غالباً کثرت کے لیے لائی جاتی ہیں' اور سورۃ الاعراف جہاں نعمتوں کا گنوانا مقصود نہیں ہے وہاں **خطیئۃ** کی جمع الف اور تاء تانیث سے لائی گئی' کیونکہ ایسی جمع غالباً قلت کی طرف اشارہ کرتی ہے' اِلا یہ کہ اس کے ساتھ ایسا قرینہ موجود ہو جو کثرت پر دلالت کرے۔ یوں دونوں سورتوں سے اس لفظ کی مناسبت ظاہر ہو گئی۔ واللہ اعلم۔

(۶) سورۃ البقرۃ میں ''واؤ'' کا اضافہ ﴿وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

چونکہ سورۃ البقرۃ میں ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ﴾ سے نعمتوں کا بیان شروع ہوا ہے اس لیے کثرتِ احسانات کی مناسبت سے ''واؤ'' کا اضافہ بھی مناسب تھا' لیکن سورۃ الاعراف میں چونکہ اس طرح کا بیان نہیں تھا اس لیے زائد ''واؤ'' لانا بھی مناسب نہ تھا۔

(۷) الاعراف میں ﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ قَوْلاً غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ﴾ ارشاد ہوا' یعنی الاعراف میں جہاں ''مِنْھُمْ'' کا اضافہ ہے جو سورۃ البقرۃ میں نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے (واللہ اعلم) کہ لفظ ''ظَلَمُوْا'' ایک عام لفظ ہے جس میں تخصیص ہو سکتی ہے جو یا تو عقلی دلیل کی بنا پر ہو گی یا سمعی دلیل کی بنا پر

اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ ایک بڑی جماعت یا ایک امت کو اگر کوئی حکم دیا جائے یا کسی بات سے روکا جائے تو اس جماعت کے سارے افراد اس حکم کے قبول کرنے میں برابر نہیں ہوں گے' کچھ کریں گے کچھ نہیں کریں گے۔ خود اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۱۱۰﴾ (آل عمران)

''ان میں مؤمن بھی ہیں لیکن اکثر فاسق ہیں۔''

اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ (آل عمران:۱۱۳)

''اہلِ کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو (سیدھے راستے پر) قائم ہیں۔'' اور ایسی دوسری آیات۔

چنانچہ اگر آپ مذکورہ آیت پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہاں عموم مراد نہیں ہے' یعنی کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے ظلم نہیں کیا ہوگا۔ سورۃ الاعراف میں ''مِنْهُمْ'' لاکر اس بات کو واضح کر دیا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت سے جو عموم ظاہر ہوتا ہے' ایسا نہیں ہے' بلکہ اس میں تخصیص واقع ہوئی ہے۔ یعنی ان میں کچھ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا تھا اور اس تخصیص کی بنا پر سورۃ البقرۃ میں صرف ظلم کرنے والوں پر عذاب نازل کرنے کا ذکر کیا گیا۔ حالانکہ ﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ﴾ بھی کہا جا سکتا تھا' لیکن پھر سب کے سب عذاب میں شامل ہو جاتے۔ گویا سورۃ البقرۃ میں ﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ کہہ کر گروہِ ظالمین کو خاص کر دیا گیا اور سورۃ الاعراف میں ''مِنْهُمْ'' کہہ کر ان کے خاص ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔

(۹'۸) اب دیکھئے کہ سورۃ الاعراف میں ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ﴾ کے الفاظ ہیں' یعنی ہم نے ان پر آسمانی عذاب بھیجا۔ گو ''اَرْسَلْنَا'' میں تعمیم پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اس سے قبل صرف ظالمین ﴿الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ کی طرف خصوصی اشارہ ہو چکا ہے اس لیے ''اَرْسَلْنَا'' سے عموم نہیں سمجھا جائے گا۔ سورۃ البقرۃ میں تو ﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ ارشاد فرما کر ویسے ہی صاف صاف بیان کر دیا گیا تھا کہ یہ عذاب صرف ظالموں پر نازل کیا گیا تھا۔ یہاں تک آٹھویں اور نویں سوال کا بھی جواب ہو گیا۔

(۱۰) اب رہ گئی آخری بات کہ سورۃ البقرۃ میں آیت کا اختتام ﴿بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ پر اور سورۃ الاعراف میں ﴿بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ﴾ پر ہوا ہے تو اس کی وجہ (واللہ اعلم) یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے پہل بنی اسرائیل کی ایک ناشکری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا' جس کو ظلم سے تعبیر کیا گیا تھا' اور ظلم کے بھی چھوٹے بڑے کافی مراتب ہو سکتے ہیں' اس لیے جب ان کی مزید نافرمانیاں ظاہر ہوئیں تو پھر ان کے لیے ''فسق'' کا لفظ استعمال کیا گیا جو ''ظلم'' سے کچھ بڑھ کر ہے۔ ملاحظہ ہو کہ یہ لفظ شیطان ابلیس کے لیے استعمال ہوا جب اس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکھف: ۵۰)

''سوائے ابلیس کے' جو کہ جنوں میں سے تھا' اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔''

اور پھر اسے ایمان کی ضد قرار دیا:

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ﴿۱۸﴾﴾ (السجدۃ)

''کیا وہ جو مؤمن ہے فاسق کی مانند ہوسکتا ہے' یہ برابر نہیں ہوسکتے۔''

ظلم کا اطلاق تو کم سے کم تر گناہ پر بھی ہوسکتا ہے' جیسے کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ﴾(النساء:۱۱۰)

''اور جو شخص برائی کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت چاہے۔''

اور ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۫﴾

(آل عمران:۱۳۵)

''اور وہ لوگ جو کہ جب بھی بدکاری کریں یا اپنے نفس پر ظلم کریں' اللہ کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں۔''

اور چونکہ ظلم کا اطلاق چھوٹے بڑے بہت سے گناہوں پر ہوتا ہے' اس لیے جہاں شرک کا ذکر آیا تو اس کے ''عظیم'' ہونے کے وصف کے ساتھ بیان کیا گیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن)

''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اب دیکھئے کہ ایک شخص جو کسی دوسرے شخص کے خلاف حاکم کے پاس شکایت لے کر آیا ہے اور وہ شکایت چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو' وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ آدمی ظالم ہے (چاہے اُس نے رائی برابر ہی ظلم کیا ہو) اور ایسا کہنے میں اُس پر کچھ لازم نہ آئے گا' لیکن اگر وہ معمولی سی کسی بات پر فاسق کہہ ڈالے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

اور جس طرح ''احسان'' کی جزاء کے بھی درجات ہیں' اسی طرح گناہوں کے بھی مراتب ہیں' اور اس کی مزید وضاحت سورۃ المائدۃ کی ان آیات کے حوالہ سے ہوگی جہاں اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کو پہلے کفر سے' پھر ظلم سے اور پھر فسق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تمہید کے بعد ملاحظہ ہو کہ سورۃ البقرۃ میں جہاں بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہوتا ہے اور انہیں نعمتیں یاد کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور پھر جہاں انہیں یاد دلایا گیا کہ کیسے بادل ان پر سائبان کی حیثیت سے تنے گئے اور پھر ان کی ناشکری کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴿۱۶۰﴾﴾ (الاعراف)

''انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا' لیکن وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔''

اس کے بعد ان کی ایک اور بڑی نافرمانی کا ذکر کیا کہ جو بات انہیں کہنے کے لیے حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس بات ہی کو بدل دیا اور اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا:

﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴿۵۹﴾﴾ (البقرۃ)

''تو ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔''

اوراس طرح ان کی تمام نافرمانیوں کے اختتام پران کے اعمال کوفسق سے تعبیر کیا گیا اوراس کے بعد پھرایسی کسی سزا کا ذکرنہیں ہے جس کے ساتھ اس کی علت کوبھی بیان کیا گیا ہو۔سورۃ الاعراف میں بھی اسی طرح کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے‘یعنی سب سے پہلی نافرمانی کے بعد ’’بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ‘‘ کہا گیا۔

پھراصحابِ سبت کا قصہ بیان ہوا‘فرمایا:

﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ﴾

’’اوران سے اس بستی کا حال پوچھئے جوسمندر پرواقع تھی۔‘‘

اور پھران کی نافرمانی کے ذکر کے بعد فسق کا ذکر کیا:

﴿كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۱۶۳﴾ (الاعراف)

’’اوراس طرح ہم ان کی آزمائش کیا کرتے تھے بسبب اس کے کہ وہ لوگ فسق کا ارتکاب کرتے تھے۔‘‘

اوریوں دونوں سورتوں میں پہلے ظلم اور پھر ’’فسق‘‘ کا بتدریج ذکر ہوا ہے۔گویا دونوں سورتوں کے طریق بیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو‘ ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الانعام

آیات ۲۵ تا ۳۲

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

وق ر

وَقَرَ يَقِرُ (س) وَقْرًا : بھرا ہوا ہونا' بوجھل ہونا۔

وَقْرٌ اور وِقْرٌ (اسم ذات) : بوجھ' زیر مطالعہ آیت ۲۵ اور ﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲﴾ (الذّٰریٰت) ''پھر بوجھ اٹھانے والیوں کی قسم۔''

وَقُرَ یُوْقُرُ ۔ یُوْقَرُ (ک۔دونوں مستعمل ہیں) وَقَارَۃً :سنجیدہ اور متین ہونا' باوقار ہونا۔

وَقَارٌ (اسم ذات): سنجیدگی' متانت' عظمت ۔﴿مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳﴾ (نوح) ''تمہیں کیا ہے کہ تم لوگ اُمید نہیں رکھتے اللہ سے عظمت کی۔''

وَقَّرَ یُوَقِّرُ (تفعیل) تَوْقِیْرًا: کسی کی تعظیم کرنا۔﴿لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ﴾ (الفتح:۹) ''تاکہ تم لوگ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور انؐ کی مدد کرو اور انؐ کی تعظیم کرو۔''

س ط ر

سَطَرَ یَسْطُرُ (ن) سَطْرًا :کسی چیز کی حفاظت کرنا۔کسی بات کو لکھنا (تاکہ محفوظ ہو جائے) ﴿وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝۱﴾ (القلم) ''قسم ہے قلم کی اور اُس کی جو یہ لوگ لکھتے ہیں۔''

مَسْطُوْرٌ (اسم المفعول) :لکھا ہوا۔﴿وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲﴾ (الطور) ''اور قسم ہے ایک لکھی ہوئی کتاب کی۔''

مُصَیْطِرٌ: یہ دراصل مُسَیْطِرٌ ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں اس کی ''ص'' کے اوپر ایک چھوٹا سا ''س'' لکھا ہوتا ہے) حفاظت کرنے والا' داروغہ۔﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝۲۲﴾ (الغاشیة) ''آپؐ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔''

سَطَّرَ یُسَطِّرُ (تفعیل) تَسْطِیْرًا :بے بنیاد باتیں جمع کرنا' فرضی کہانیاں یا قصے بنانا' افسانہ یا ناول لکھنا۔

اُسْطُوْرَۃٌ ج اَسَاطِیْرُ (اسم ذات ہے) :فرضی کہانی۔زیر مطالعہ آیت ۲۵۔

اِسْتَطَرَ یَسْتَطِرُ (افتعال) اِسْتِطَارًا :اہتمام سے لکھنا۔

مُسْتَطَرٌ (اسم المفعول):لکھا ہوا۔﴿وَكُلُّ صَغِیْرٍ وَّكَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳﴾ (القمر) ''اور تمام چھوٹی بڑی چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔''

ن ء ی

نَأَی یَنْأَی (ف) نَأْیًا :(۱) کسی سے بچنا' دور ہونا۔(۲) کسی کو کسی سے بچانا' موڑ لینا۔آیت زیر مطالعہ آیت ۲۶۔﴿وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ (بنی اسراء یل:۸۳) ''اور جب بھی ہم انعام کرتے ہیں انسان پر تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور موڑ لیتا ہے اپنے پہلو کو۔''

و ق ف

وَقَفَ یَقِفُ (ض) وَقْفًا :ٹھہرانا' روکنا۔زیر مطالعہ آیت ۲۷۔

قِفْ (فعل امر) :تو ٹھہرا' تو روک۔﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۝۲۴﴾ (الصّٰفّٰت) ''اور تم لوگ ٹھہراؤ ان کو بے شک یہ لوگ پوچھے جانے والے ہیں۔''

مَوْقُوْفٌ (اسم المفعول) :ٹھہرایا ہوا' روکا ہوا۔﴿وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (سبا:۳۱) ''اور اگر تو دیکھے جب ظالم لوگ روکے جانے والے ہوں گے اپنے رب کے پاس۔''

ب غ ت

بَغَتَ یَبْغَتُ (ف) بَغْتًا :کسی چیز کا اچانک نمودار ہونا۔

بَغْتَةً (حال) :اچانک' بے گمان' زیر مطالعہ آیت ۳۱۔

ف ر ط

فَرَطَ یَفْرُطُ (ن) فُرُوْطًا :آگے بڑھنا' حد سے گزرنا' کسی پر زیادتی کرنا۔﴿اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا﴾ (طٰہٰ:۴۵) ''ہمیں خوف ہے کہ وہ زیادتی کرے ہم پر۔''

فَرْطًا (یہ بھی مصدر ہے) :کسی کام میں کوتاہی کرنا' کمی کرنا۔

فُرُطًا (حال): حد سے گزرا ہوا۔﴿وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا﴾ (الکھف) ''اور تھا ان کا کام حد سے گزرا ہوا۔''

اَفْرَطَ یُفْرِطُ (افعال) اِفْرَاطًا :حد سے گزارنا' زیادہ کرنا۔

مُفْرَطٌ (اسم المفعول) :زیادہ کیا ہوا۔﴿لَا جَرَمَ اَنَّ لَھُمُ النَّارَ وَاَنَّھُمْ مُّفْرَطُوْنَ﴾ (النحل) ''کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کے لیے آگ ہے اور یہ کہ وہ لوگ زیادہ کیے جا رہے ہیں۔''

فَرَّطَ یُفَرِّطُ (تفعیل) تَفْرِیْطًا :مسلسل کوتاہی کرنا' کمی کرنا۔زیر مطالعہ آیت ۳۱۔

و ز ر

وَزَرَ یَزِرُ (ض) وَزْرًا :(۱) پہاڑ میں پناہ گاہ بنانا۔(۲) کوئی بوجھل چیز اٹھانا۔زیر مطالعہ آیت ۳۱۔

وِزْرٌ ج اَوْزَارٌ (اسم ذات) :بوجھ۔﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (الانعام:۱۶۴) ''اور نہیں اٹھائے گی کوئی اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ۔''﴿لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَھُمْ کَامِلَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ﴾ (النحل:۲۵) ''تاکہ وہ لوگ اٹھائیں اپنے بوجھ پورے پورے اور ان کے بوجھ میں سے بھی انہوں نے گمراہ کیا جن کو کسی علم کے بغیر۔''

وَزَرٌ (اسم ذات) :پناہ گاہ۔﴿کَلَّا لَا وَزَرَ ﴾ (القیامۃ) ''ہرگز نہیں' کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔''

وَازِرٌ (اسم الفاعل) :اٹھانے والا۔اوپر آیت الانعام:۱۶۴ دیکھیں۔

وَزِیْرٌ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت) :ہر حال میں ہمیشہ بوجھ بٹانے والا' معاون۔﴿وَجَعَلْنَا مَعَہٗٓ اَخَاہُ ھٰرُوْنَ وَزِیْرًا﴾ (الفرقان) ''اور ہم نے بنایا ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو ایک معاون۔''

ل ھ و

لَھَا یَلْھُوْ (ف۔ن) لَھْوًا :(۱) مانوس ہونا' پسند کرنا۔(۲) کسی چیز سے غافل ہونا (پسندیدہ چیز میں مشغول ہونے کے سبب)

لَاہٍ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت): غافل ہونے والا یعنی غافل۔﴿لَاھِیَۃً قُلُوْبُھُمْ ؕ﴾ (الانبیاء:۳) ''غافل ہوتے ہوئے ان کے دل۔''

لَھْوٌ (اسم ذات) :ہر وہ چیز جس کا شغل کسی اہم کام سے غافل کر دے' تماشا۔زیر مطالعہ آیت ۳۲۔

اَلْھَا یُلْھِیْ (افعال) اِلْھَاءً: کسی کو کسی چیز سے غافل کرنا۔﴿لَا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ (النور:۳۷) ''غافل نہیں کرتی ان کو تجارت اور نا ہی خرید و فروخت اللہ کی یاد سے۔''

تَلَھّٰی یَتَلَھّٰی (تفعّل) تَلَھٍّ :کسی سے غفلت برتنا۔﴿فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی﴾ (عبس) ''تو آپؐ نے

اس سے غفلت برتی۔''

ترکیب :

''اَکِنَّۃً''اور''وَقْرًا'' یہ دونوں ''جَعَلْنَا'' کے مفعول ہیں۔''وَلَوْ تَرٰی''شرطیہ ہے اس لیے''اِذ وُقِفُوْا''اور''فَقَالُوْا'' کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔''یٰلَیْتَنَا''حرفِ تمنا ہے''نُرَدُّ''تمنا ہے''لَا نُکَذِّبَ''اور ''نَکُوْنَ'' واو صرف کی وجہ سے جوابِ تمنا ہیں۔حالتِ نصب میں ہیں۔

ترجمہ:

وَمِنْھُمْ مَّنْ :اوران میں وہ بھی ہیں جو
اِلَیْکَ :آپؐ کی طرف
جَعَلْنَا :ہم نے بنائے
اَکِنَّۃً :کچھ پردے
یَّفْقَھُوْہُ :وہ (نہ) سمجھیں اس کو
وَقْرًا :ایک بوجھ
یَّرَوْا :وہ دیکھیں
لَّا یُؤْمِنُوْا :تب بھی ایمان نہیں لائیں گے
حَتّٰٓی :یہاں تک کہ
جَآءُوْکَ :وہ آتے ہیں آپؐ کے پاس
یَقُوْلُ الَّذِیْنَ: کہتے ہیں ان سے جنہوں نے
اِنْ :نہیں ہے
اِلَّآ :مگر
وَھُمْ :اوروہ
عَنْہُ :اس سے
عَنْہُ :اس سے
یُّھْلِکُوْنَ :ہلاک کرتے وہ
اَنْفُسَھُمْ :اپنے آپ کو
مَا یَشْعُرُوْنَ :وہ شعور نہیں رکھتے
اِذْ :جب
عَلَی النَّارِ :آگ پر
یٰلَیْتَنَا :اے کاش
یَّسْتَمِعُ :کان لگاتے ہیں
وَ :حالانکہ
عَلٰی قُلُوْبِھِمْ :ان کے دلوں پر
اَنْ :کہ
وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ :اوران کے کانوں میں
وَاِنْ :اوراگر
کُلَّ اٰیَۃٍ :ساری نشانی
بِھَا :اس پر
اِذَا :جب بھی
یُجَادِلُوْنَکَ :تو بحث کرتے ہیں آپؐ سے
کَفَرُوْٓا :کفر کیا
ھٰذَآ :یہ
اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ :پہلے لوگوں کے افسانے
یَنْھَوْنَ :روکتے ہیں
وَیَنْئَوْنَ :اوردور ہوتے ہیں
وَاِنْ :اورنہیں
اِلَّآ :مگر
وَ:اس حال میں کہ
وَلَوْ تَرٰٓی :اوراگر تو دیکھے
وُقِفُوْا :وہ لوگ ٹھہرائے جائیں گے
فَقَالُوْا :تو کہیں گے
نُرَدُّ :ہم لوٹائے جاتے

وَ :اور

بِاٰیٰتِ رَبِّنَا :اپنے رب کی نشانیوں کو

نَکُوْنَ :ہم ہو جاتے

بَلْ : بلکہ

لَھُمْ :ان کے لیے

کَانُوْا یُخْفُوْنَ :وہ لوگ چھپاتے تھے

وَلَوْ :اور اگر

لَعَادُوْا :تو ضرور دوبارہ کریں گے

نُھُوْا :انہیں روکا گیا

وَاِنَّھُمْ :اور بے شک یہ لوگ

وَقَالُوْٓا :اور انہوں نے کہا

ھِیَ :یہ

حَیَاتُنَا الدُّنْیَا :ہماری دنیا کی زندگی

بِمَبْعُوْثِیْنَ :دوبارہ اٹھائے جانے والے

اِذْ وُقِفُوْا :جب وہ ٹھہرائے جائیں گے

قَالَ :وہ (یعنی رب) کہے گا

بِالْحَقِّ :حق

بَلٰی : کیوں نہیں

قَالَ :وہ کہے گا

الْعَذَابَ :عذاب کو

کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ :تم لوگ کفر کرتے تھے

الَّذِیْنَ :وہ جنہوں نے

بِلِقَآءِ اللّٰہِ :اللہ کی ملاقات کو

اِذَا :جب کبھی

السَّاعَۃُ :(موت کی) گھڑی

قَالُوْا :تو کہتے ہیں

عَلٰی مَا :اس پر جو

فِیْھَا :اس میں

اَوْزَارَھُمْ :اپنے بوجھ

لَا نُکَذِّبَ :ہم نہ جھٹلاتے

وَ :اور

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ :ایمان لانے والوں میں سے

بَدَا :نمایاں ہوا

مَّا :وہ جو

مِنْ قَبْلُ :اس سے پہلے

رُدُّوْا :وہ لوٹائے جائیں

لِمَا :اس کو

عَنْہُ :جس سے

لَکٰذِبُوْنَ :یقیناً جھوٹ کہنے والے ہیں

اِنْ :نہیں ہے

اِلَّا :مگر

وَمَا نَحْنُ :اور نہیں ہیں ہم

وَلَوْ تَرٰٓی :اور اگر تو دیکھے

عَلٰی رَبِّھِمْ :ان کے رب کے سامنے

اَلَیْسَ ھٰذَا :کیا یہ نہیں ہے

قَالُوْا :وہ کہیں گے

وَرَبِّنَا :ہمارے رب کی قسم ہے

فَذُوْقُوْا :تو تم چکھو

بِمَا :بسبب اس کے جو

قَدْ خَسِرَ :گھاٹے میں رہے

کَذَّبُوْا :جھٹلایا

حَتّٰٓی :یہاں تک کہ

جَآءَتْھُمْ :آتی ہے ان کے پاس

بَغْتَۃً :بے گمان

یٰحَسْرَتَنَا :ہائے ہماری حسرت

فَرَّطْنَا :ہم نے کوتاہی کی

وَھُمْ یَحْمِلُوْنَ :اور وہ اٹھائیں گے

عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ :اپنی پیٹھوں پر

اَلَا : خبردار	سَآءَ : برا ہے
مَا : وہ جو	یَزِرُوْنَ : یہ بوجھ اٹھاتے ہیں
وَمَا : اور نہیں ہے	اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ : دنیوی زندگی
اِلَّا : مگر	لَعِبٌ : ایک کھیل
وَّلَھْوٌ : اور ایک تماشا	وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ : اور یقیناً آخری گھر
خَیْرٌ : بہتر ہے	لِّلَّذِیْنَ : ان کے لیے جو
یَتَّقُوْنَ : تقویٰ کرتے ہیں	اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ : کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے

نوٹ: زیر مطالعہ آیت ۳۲ میں دنیا کی زندگی کو کھیل اور تماشا کہا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ دراصل اس کو کھیل اور تماشے سے اس لیے تشبیہہ دی گئی ہے کہ یہاں حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں' جن میں پھنس کر کچھ انسان ایسا عجیب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں کہ ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ (تفہیم القرآن)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے ذکر اللہ یا عالم یا طالب علم کے۔ امام جزریؒ کی تصریح کے مطابق دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ کی اطاعت میں کیا جائے وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سب ضروری کام' جائز طریقے سے روزی کمانا اور دوسری ضروریات جو حدودِ شریعت سے باہر نہ ہوں' وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں۔ احادیث میں اہل وعیال اقرباء' احباب' پڑوسی' مہمان وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو صدقہ اور عبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۳۳ تا ۳۷

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤی اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

ج ح د

جَحَدَ یَجْحَدُ (ف) جَحْدًا: اس کا انکار کرنا جس کا دل میں اقرار ہو۔ جانتے بوجھتے انکار کرنا۔ آیت زیر مطالعہ ۳۳۔

ترکیب :

''اِنَّهٗ'' میں ضمیر الشان ہے۔ (دیکھئے البقرۃ:۸۵ نوٹ ۱) ''لَیَحْزُنُكَ'' کا فاعل ''الَّذِی'' ہے۔ ''الظّٰلِمِیْنَ'' پر لام تعریف ہے۔ (آیت ۳۴) ''رُسُلٌ'' اسم عاقل کی جمع مکسر ہے' اس لیے واحد مؤنث کا صیغہ ''كُذِّبَتْ'' بھی جائز ہے۔ ''جَاءَكَ'' کا فاعل ''اَنْبَاءٌ'' محذوف ہے۔ ''نَبَای'' میں یا زائدہ ہے۔ یہ اصل میں ''مِنْ نَبَاٍ'' تھا' ''اَلْمُرْسَلِیْنَ'' کا مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ختم ہوئی ہے۔ (آیت ۳۵) ''اِنْ'' شرطیہ کی وجہ سے ''كَانَ'' کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ ''فَتَاْتِیَهُمْ'' میں فا سببیہ کی وجہ سے ''تَاْتِیَ'' حالت نصب میں آیا ہے۔ (آیت ۳۷) ''نُزِّلَ'' کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے ''اٰیَةٌ'' حالت رفع میں ہے۔

ترجمہ:

قَدْ نَعْلَمُ : ہم جان چکے ہیں	اِنَّهٗ : کہ یہ حقیقت ہے کہ
لَیَحْزُنُكَ : بے شک غمگین کرتی ہے آپؐ کو	الَّذِیْ : وہ (بات) جو
یَقُوْلُوْنَ : یہ لوگ کہتے ہیں	فَاِنَّهُمْ : تو بے شک یہ لوگ
لَا یُكَذِّبُوْنَكَ : نہیں جھٹلاتے آپؐ کو	وَلٰكِنَّ : اور لیکن (یعنی بلکہ)
الظّٰلِمِیْنَ : یہ ظالم لوگ	بِاٰیٰتِ اللّٰهِ : اللہ کی نشانیوں کا
یَجْحَدُوْنَ : جانتے بوجھتے انکار کرتے ہیں	وَلَقَدْ كُذِّبَتْ : اور بے شک جھٹلائے جا چکے ہیں
رُسُلٌ : بہت سے رسول	مِّنْ قَبْلِكَ : آپؐ سے پہلے
فَصَبَرُوْا : تو وہ ثابت قدم رہے	عَلٰی مَا : اس پر جس پر
كُذِّبُوْا : انہیں جھٹلایا گیا	وَاُوْذُوْا : اور انہیں اذیت دی گئی
حَتّٰٓی : یہاں تک کہ	اَتٰىهُمْ : آئی ان کے پاس
نَصْرُنَا : ہماری مدد	وَلَا مُبَدِّلَ : اور کوئی بھی بدلنے والا نہیں ہے
لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ : اللہ کے فرمانوں کو	وَلَقَدْ جَآءَكَ : اور بے شک آ چکی ہیں آپ کے پاس (کچھ خبریں)
مِنْ نَّبَای الْمُرْسَلِیْنَ : بھیجے ہوؤں (یعنی رسولوں) کی خبر میں سے	وَاِنْ كَانَ : اور اگر ہے
كَبُرَ : بہت بھاری	عَلَیْكَ : آپؐ پر
اِعْرَاضُهُمْ : ان کا اعراض کرنا	فَاِنِ : تو اگر
اسْتَطَعْتَ : آپ میں استطاعت ہے	اَنْ : کہ
تَبْتَغِیَ : آپؐ تلاش کریں	نَفَقًا : کوئی سرنگ
فِی الْاَرْضِ : زمین میں	اَوْ : یا

سُلَّمًا : کوئی سیڑھی
فَتَاْتِيَهُمْ : تو آپؐ لے آئیں ان کے پاس
وَلَوْ : اور اگر
اللّٰهُ : اللہ
عَلَى الْهُدٰى : ہدایت پر
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ : نادانوں میں سے
يَسْتَجِيْبُ : جواب دیتے ہیں (یعنی مانتے ہیں)
يَسْمَعُوْنَ : سنتے ہیں
يَبْعَثُهُمُ : اٹھائے گا ان کو
ثُمَّ : پھر
يُرْجَعُوْنَ : وہ لوٹائے جائیں گے
لَوْلَا : کیوں نہیں
عَلَيْهِ : انؐ پر
مِّنْ رَّبِّهٖ : انؐ کے رب (کی طرف) سے
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
عَلٰٓى : اس پر
يُّنَزِّلَ : وہ اُتارے
وَّلٰكِنَّ : اور لیکن
لَا يَعْلَمُوْنَ : علم نہیں رکھتے

فِي السَّمَآءِ : آسمان میں
بِاٰيَةٍ : کوئی نشانی
شَآءَ : چاہتا
لَجَمَعَهُمْ : تو جمع کر دیتا ان کو
فَلَا تَكُوْنَنَّ : پس آپؐ ہرگز نہ ہوں
اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو
وَالْمَوْتٰى : اور مردے!
اللّٰهُ : اللہ
اِلَيْهِ : اُسی کی طرف
وَقَالُوْا : اور انہوں نے کہا
نُزِّلَ : اتاری گئی
اٰيَةٌ : کوئی نشانی
قُلْ : آپؐ کہیے
قَادِرٌ : قدرت رکھنے والا ہے
اَنْ : کہ
اٰيَةً : کوئی نشانی
اَكْثَرَهُمْ : ان کے اکثر

نوٹ: رسول اللہ ﷺ جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے ہوئے مدت گزر گئی ہے اور یہ راہِ راست پر نہیں آ رہے تو آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے' اسے تصرف کے اختیارات دیے ہیں' اطاعت اور نافرمانی کی آزادی بخشی ہے' امتحان کی مہلت عطا کی ہے اور اس کے طرزِ عمل کے مطابق جزا و سزا دینے کے لیے فیصلے کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۳۸ تا ۴۵

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ
مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ

اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ط وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ
اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ج اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ ع وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ
قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا
ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً
فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ط وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترکیب :

''مِنْ دَابَّةٍ'' کے ''مِنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''طٰئِرٍ'' حالت جر میں ہے اور یہ نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''جَنَاحَیْ'' دراصل ''جَنَاحَیْنِ'' (تثنیہ) تھا' مضاف ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا ہے۔ ''اُمَمٌ'' خبر ہے اور اس کا مبتدا محذوف ہے۔ (آیت ۳۹) ''فِیْ ظُلُمٰتٍ'' قائم مقام خبر ہے اور اس کا بھی مبتدا محذوف ہے۔ (آیت ۴۰) ''تَدْعُوْنَ'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے ''غَیْرَ اللّٰهِ'' حالت نصب میں ہے۔ (آیت ۴۲) ''لَقَدْ اَرْسَلْنَا'' کا مفعول ''رُسُلًا'' محذوف ہے۔ (آیت ۴۳) ''فَلَوْلَا'' فعل ''تَضَرَّعُوْا'' سے متعلق ہے' درمیان میں ''اِذْ جَآءَ هُمْ بَاْسُنَا'' جملہ معترضہ ہے۔

ترجمہ:

وَمَا : اور نہیں ہے
فِی الْاَرْضِ : زمین میں
طٰئِرٍ : کوئی بھی اڑنے والا
بِجَنَاحَیْهِ : اپنے دونوں بازوؤں سے
اُمَمٌ : (وہ بھی) امتیں ہیں
مَا فَرَّطْنَا : ہم نے کمی نہیں کی
مِنْ شَیْءٍ : کچھ بھی
اِلٰی رَبِّهِمْ : ان کے رب کی طرف ہی
وَالَّذِیْنَ : اور وہ لوگ' جنہوں نے
بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
وَّبُكْمٌ : اور گونگے ہیں
مَنْ : جس کو
اللّٰهُ : اللہ

مِنْ دَآبَّةٍ : کوئی بھی چلنے والا
وَلَا : اور نہ ہی ہے
یَّطِیْرُ : جو اڑتا ہے
اِلَّآ : مگر یہ کہ
اَمْثَالُكُمْ : تم لوگوں کی مانند
فِی الْكِتٰبِ : کتاب میں
ثُمَّ : پھر
یُحْشَرُوْنَ : وہ سب جمع کیے جائیں گے
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
صُمٌّ : بہرے ہیں
فِی الظُّلُمٰتِ : (وہ لوگ) اندھیروں میں ہیں
یَّشَاِ : چاہتا ہے
یُضْلِلْهُ : (تو) وہ گمراہ کرتا ہے اس کو

وَمَنْ :اور جس کو
يَجْعَلْهُ :(تو) وہ ڈالتا ہے اس کو

قُلْ :آپؐ کہیے
رَءَيْتَكُمْ :تو نے دیکھا اپنے لوگوں کو
اَتٰىكُمْ :آئے تمہارے پاس
اَوْ اَتَتْكُمُ :یا آئے تم پر
اَ :تو کیا
تَدْعُوْنَ :تم لوگ پکارو گے
كُنْتُمْ :تم لوگ ہو
بَلْ اِيَّاهُ : بلکہ صرف اس کو ہی
فَيَكْشِفُ :تو وہ کھول دیتا ہے
تَدْعُوْنَ :تم لوگ پکارتے ہو
اِنْ :اگر
وَتَنْسَوْنَ :اور بھول جاتے ہو
تُشْرِكُوْنَ :تم لوگ شریک کرتے ہو

اِلٰٓى اُمَمٍ :امتوں کی طرف
فَاَخَذْنٰهُمْ : پھر ہم نے پکڑا اُن کو
وَالضَّرَّآءِ :اور تکلیف سے
يَتَضَرَّعُوْنَ: گڑگڑائیں
اِذْ جَآءَهُمْ :جب آئی اُن کے پاس
تَضَرَّعُوْا :وہ لوگ گڑگڑاتے
قَسَتْ :سخت ہوئے
وَزَيَّنَ :اور مزین کیا
الشَّيْطٰنُ :شیطان نے
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ :وہ لوگ کرتے تھے
نَسُوْا :وہ بھولے

يَّشَاْ :وہ چاہتا ہے
عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : ایک سیدھے راستے پر
اَ :کیا
اِنْ :کہ اگر
عَذَابُ اللّٰهِ :اللہ کا عذاب
السَّاعَةُ :قیامت
غَيْرَ اللّٰهِ :اللہ کے علاوہ (کسی) کو
اِنْ :اگر
صٰدِقِيْنَ :سچ کہنے والے
تَدْعُوْنَ :تم لوگ پکارتے ہو
مَا :اس کو
اِلَيْهِ :جس کے لیے
شَآءَ :وہ چاہتا ہے
مَا :اس کو، جس کو
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ : اور ہم بھیج چکے ہیں (رسولوں کو)
مِّنْ قَبْلِكَ :آپؐ سے پہلے
بِالْبَاْسَآءِ :سختی سے
لَعَلَّهُمْ :شاید کہ وہ لوگ
فَلَوْلَآ :تو کیوں نہیں
بَاْسُنَا :ہماری سختی
وَلٰكِنْ :اور لیکن
قُلُوْبُهُمْ :ان کے دل
لَهُمُ :ان کے لیے
مَا :اس کو جو
فَلَمَّا :پھر جب
مَا :اس کو

ذُكِّرُوْا : ان کی یاددہانی کرائی گئی
فَتَحْنَا : تو ہم نے کھول دیے
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز کے دروازے
اِذَا : جب
بِمَآ : اس سے جو
اَخَذْنٰهُمْ : تو ہم نے پکڑا ان کو
فَاِذَا : تب پھر
مُّبْلِسُوْنَ : انتہائی غمگین ہوئے
دَابِرُ الْقَوْمِ : اس قوم کی جڑ
ظَلَمُوْا : ظلم کیا
لِلّٰهِ : اللہ ہی کے لیے ہے

بِهٖ : جس سے
عَلَيْهِمْ : ان پر
حَتّٰٓى : یہاں تک کہ
فَرِحُوْا : وہ بہت خوش ہوئے
اُوْتُوْٓا : دیا گیا ان کو
بَغْتَةً : اچانک
هُمْ : وہ لوگ
فَقُطِعَ : پھر کاٹی گئی
الَّذِيْنَ : جنہوں نے
وَالْحَمْدُ : اور تمام شکر و سپاس
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : جو تمام جہانوں کا ربّ ہے

نوٹ: اس کائنات میں' زمین میں ہو یا فضاؤں میں' جہاں کہیں جو بھی چیز ہے' ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی صناعی' قدرت اور سبحانیت (perfectionism) کی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر انسان اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات کا ادراک حاصل کر سکتا ہے۔ یہ کیسی نشانیاں ہیں اور ان سے کیا مراد ہے' اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ اگر کسی پارک میں گھاس' بوٹے' جھاڑیاں وغیرہ بے ترتیبی سے اُگے ہوئے ہیں تو اسے دیکھنے والا ہر شخص یہی کہے گا کہ اس پارک کا کوئی مالی نہیں ہے۔ دوسرے پارک میں گھاس ہموار ہے' بوٹے ترتیب سے لگے ہوئے ہیں اور جھاڑیاں تراش کر کیاریاں بنی ہوئی ہیں لیکن مالی کہیں نظر نہیں آ رہا ہے' پھر بھی باغ کی حالت دیکھ کر ہر شخص مالی کے وجود کو بھی تسلیم کرے گا اور اس کی صلاحیت کا بھی اسے اندازہ ہو جائے گا۔

اسی طرح ہر جاندار کے جسم میں ایک نظام اپنا کام کر رہا ہے اور خود کائنات میں ایک نظم و ترتیب موجود ہے جسے دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کا ایک خالق ہے جو ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے اور یہ سب کچھ خود بخود وجود میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر ''عظیم دھماکہ'' (Big Bang) تھیوری پر تنقید کرتے ہوئے اور اسے رد کرتے ہوئے ایک مغربی سائنس دان نے کہا ہے کہ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ایک پریس میں دھماکہ ہوا اور ایک عظیم لغت (Dictionary) خود بخود وجود میں آ گئی۔

کائنات کی ہر چیز میں اپنے وجود اور اپنی صفات کی نشانیاں اور انسان میں مشاہدہ اور غور و فکر کی صلاحیتیں ودیعت کر کے اللہ تعالیٰ نے نتیجہ اخذ کرنے اور اپنی رائے قائم کرنے کے لیے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ انسان کی اس آزادی میں وہ مداخلت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو کائنات اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بجائے انہیں باہمی تکاثر اور تفاخر پر صرف کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ بہروں اور گونگوں کی مانند ہیں اور لاعلمی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں' خواہ اپنے پیشے میں ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کر لیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا فتویٰ تو یہی ہے۔

پھر جو لوگ اپنی صلاحیتوں کو کائنات اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں‘ ان میں سے کسی کو گمراہی ملتی ہے اور کسی کو یہی نشانیاں سیدھی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کون کس نیت اور ارادے سے تحقیق و جستجو کرتا ہے۔ جو ایک نامور سائنس دان اور موجد بننے کے لیے کرتا ہے‘ اس کے حصے میں مادہ پرستی آتی ہے اور جو واقعی زندگی کے مقصد کا متلاشی ہوتا ہے‘ اس کو یہی نشانیاں سیدھی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ اصولوں اور نظام کے تحت ہوتا ہے‘ اس لیے گمراہ کرنے اور ہدایت دینے کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ جبکہ رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے کے اختیار اور آزادی کی بنیاد پر انسان کی ذمہ داری اور جواب دہی برقرار رہتی ہے۔

آیات ۴۶ تا ۵۰

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ص د ف

صَدَفَ يَصْدِفُ (ض) صَدْفًا: ہٹانا‘ کنارے کرنا (متعدی) پھر جانا‘ کنارہ کش ہونا (لازم) زیر مطالعہ آیت نمبر ۴۶۔

صَدَفٌ (اسم ذات): کسی چیز کا کنارہ۔ ﴿حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ﴾ (الکھف:۹۶) ’’یہاں تک کہ جب برابر کر دیا دونوں کناروں کے درمیان کو۔‘‘

ترکیب:

(آیت ۴۷) ’’بَغْتَةً‘‘ اور ’’جَهْرَةً‘‘ حال ہیں‘ اسی لیے حالت نصب میں ہیں۔ ’’يُهْلَكُ‘‘ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے ’’اَلْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ‘‘ حالت رفع میں ہے۔ (آیت ۴۸) ’’اَصْلَحَ‘‘ کا مفعول محذوف ہے جو کہ ’’اَنْفُسَهُمْ‘‘ ہوسکتا ہے۔ (آیت ۵۰) ’’اِنْ اَتَّبِعُ‘‘ کا ’’اِنْ‘‘ نافیہ ہے‘ کیونکہ آگے ’’اِلَّا‘‘ آ رہا ہے۔

ترجمہ:

قُلْ: آپؐ کہیے

اَ: کیا

رَءَيْتُمْ: تم لوگوں نے غور کیا

اِنْ: (کہ) اگر

اَخَذَ : پکڑ لے
سَمْعَكُمْ :تمہاری سماعت کو
وَخَتَمَ :اور وہ مہر لگا دے
مَّنْ :تو کون
غَيْرُ اللّٰهِ :اللہ کے علاوہ
بِهٖ :اس کو
كَيْفَ : کیسے
الْاٰيٰتِ :نشانیوں (یعنی دلیلوں) کو
هُمْ :وہ لوگ
قُلْ : آپؐ کہیے
رَءَيْتَكُمْ :تو نے دیکھا اپنوں کو
اَتٰىكُمْ : آئے تمہارے پاس
بَغْتَةً :اچانک
جَهْرَةً :کھلم کھلا
يُهْلَكُ :ہلاک کیا جائے گا
الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ :ظلم کرنے والی قوم کے
الْمُرْسَلِيْنَ : بھیجے ہوؤں کو
مُبَشِّرِيْنَ :بشارت دینے والا
فَمَنْ :پھر جو
وَاَصْلَحَ :اور اس نے اصلاح کی (اپنی)
عَلَيْهِمْ :ان پر
هُمْ :وہ لوگ
وَالَّذِيْنَ :اور وہ لوگ جنہوں نے
بِاٰيٰتِنَا :ہماری نشانیوں کو
الْعَذَابُ :عذاب
كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ :وہ لوگ نافرمانی کرتے تھے
لَآ اَقُوْلُ :میں نہیں کہتا
عِنْدِيْ :کہ میرے پاس

اللّٰهُ :اللہ
وَاَبْصَارَكُمْ :اور تمہاری بصارت کو
عَلٰى قُلُوْبِكُمْ :تمہارے دلوں پر
اِلٰهٌ :الٰہ ہے
يَاْتِيْكُمْ :جو لا دے تمہارے پاس
اُنْظُرْ : آپؐ دیکھیں
نُصَرِّفُ :ہم گھماتے ہیں
ثُمَّ :پھر (بھی)
يَصْدِفُوْنَ :کنارہ کش ہوتے ہیں
اَ :کیا
اِنْ :(کہ) اگر
عَذَابُ اللّٰهِ :اللہ کا عذاب
اَوْ :یا
هَلْ :تو کیا (یعنی کون)
اِلَّا :سوائے
وَمَا نُرْسِلُ :اور ہم نہیں بھیجتے
اِلَّا :مگر
وَمُنْذِرِيْنَ :اور خبردار کرنے والا ہوتے ہوئے
اٰمَنَ :ایمان لایا
فَلَا خَوْفٌ :تو کوئی خوف نہیں ہے
وَلَا :اور نہ ہی
يَحْزَنُوْنَ :غمگین ہوتے ہیں
كَذَّبُوْا :جھٹلایا
يَمَسُّهُمُ :پہنچے گا ان کو
بِمَا :بسبب اس کے جو
قُلْ : آپؐ کہیے
لَكُمْ :تم لوگوں سے
خَزَآئِنُ اللّٰهِ :اللہ کے خزانے ہیں

وَلَآ اَعْلَمُ : اور نہ ہی میں جانتا ہوں
وَلَآ اَقُوْلُ : اور نہ ہی میں کہتا ہوں
اِنِّیْ : کہ میں
اِنْ اَتَّبِعُ : میں پیروی نہیں کرتا
مَا : اس کی جو
اِلَیَّ : میری طرف
هَلْ : کیا
الْاَعْمٰی : اندھے
اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ : تو کیا تم لوگ غور وفکر نہیں کرتے

الْغَیْبَ : غیب کو
لَكُمْ : تم لوگوں سے
مَلَكٌ : کوئی فرشتہ ہوں
اِلَّا : مگر
یُوْحٰٓی : وحی کیا گیا
قُلْ : آپؐ کہیے
یَسْتَوِی : برابر ہوتے ہیں
وَالْبَصِیْرُ : اور دیکھنے والے

آیات ۵۱ تا ۵۵

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۵۵﴾

ط ر د

طَرَدَ یَطْرُدُ (ن) طَرْدًا : کسی کو حقیر سمجھ کر دور کرنا' دھتکارنا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۲۔

طَارِدٌ (اسم الفاعل): دھتکارنے والا۔ ﴿وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ (الشُّعراء) ''اور میں مؤمنوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔''

ترکیب :

(آیت ۵۱) ''بِهٖ'' میں ضمیر گزشتہ آیت میں ''مَا یُوْحٰی'' کے لیے ہے' یعنی قرآن مجید۔ ''مِنْ دُوْنِهٖ'' میں ضمیر ''رَبّ'' کے لیے ہے۔ (آیت ۵۲) ''یُرِیْدُوْنَ'' حال ہے ''یَدْعُوْنَ'' کا۔ فعل نہی اور فعل نفی کے جواب میں اگر فعل مضارع آتا ہے تو وہ حالت نصب میں ہوتا ہے۔ یہاں ''فَتَطْرُدَ'' کی نصب فعل نہی ''وَلَا تَطْرُدْ'' کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ فعل نفی ''مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ'' کی وجہ سے ہے' جبکہ ''فَتَكُوْنَ'' فَا سببیہ کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت ۵۳) ''لِیَقُوْلُوْا'' پر لام کَی نہیں بلکہ لامِ عاقبت ہے۔ (آیت ۵۴)

''اَنَّهٗ'' میں ضمیر الشان ہے جبکہ ''فَاَنَّهٗ'' میں ضمیر ربّ کے لیے ہے۔ ''مَنْ عَمِلَ'' کا ''مَنْ'' شرطیہ ہے' اس لیے ترجمہ حال میں ہوگا۔ (آیت ۵۵) ''تَسْتَبِيْنَ'' واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور ''سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ'' اس کا فاعل ہے۔

ترجمہ:

وَاَنْذِرْ :اور آپؐ خبردار کریں
الَّذِيْنَ :ان لوگوں کو جو
اَنْ :کہ
اِلٰى رَبِّهِمْ :اپنے رب کی طرف
لَهُمْ :ان کے لیے
وَلِيٌّ :کوئی کارساز
لَّعَلَّهُمْ :شاید کہ وہ لوگ
وَلَا تَطْرُدِ :اور آپؐ مت دور کریں
يَدْعُوْنَ :پکارتے ہیں
بِالْغَدٰوةِ :صبح سویرے
يُرِيْدُوْنَ :چاہتے ہوئے
مَا عَلَيْكَ :نہیں ہے آپؐ پر
مِّنْ شَيْءٍ :کچھ بھی
مِنْ حِسَابِكَ :آپؐ کے حساب میں سے
مِّنْ شَيْءٍ :کچھ بھی
فَتَكُوْنَ :تو آپؐ ہو جائیں گے
وَكَذٰلِكَ :اور اس طرح
بَعْضَهُمْ :ان کے بعض کو
لِّيَقُوْلُوْٓا :تو وہ کہتے ہیں
اَهٰٓؤُلَآءِ :یہ لوگ ہیں
اللّٰهُ :اللہ نے
مِّنْۢ بَيْنِنَا :ہمارے درمیان سے
لَيْسَ :نہیں ہے
بِاَعْلَمَ :سب سے زیادہ جاننے والا
وَاِذَا :اور جب بھی

بِهٖ :اس سے
يَخَافُوْنَ :ڈرتے ہیں
يُّحْشَرُوْٓا :وہ اکٹھا کیے جائیں گے
لَيْسَ :نہیں ہے
مِّنْ دُوْنِهٖ :جس کے علاوہ
وَّلَا شَفِيْعٌ :اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا
يَّتَّقُوْنَ :تقویٰ اختیار کریں
الَّذِيْنَ :ان لوگوں کو جو
رَبَّهُمْ :اپنے ربّ کو
وَالْعَشِيِّ :اور شاموں کو
وَجْهَهٗ :اس کے چہرے (یعنی توجہ) کو
مِنْ حِسَابِهِمْ :ان کے حساب میں سے
وَّمَا :اور نہیں ہے
عَلَيْهِمْ :ان لوگوں پر
فَتَطْرُدَهُمْ :پھر بھی آپ دور کریں گے ان کو
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والوں میں سے
فَتَنَّا :ہم نے آزمایا
بِبَعْضٍ :بعض سے
اَ :کیا
مَنَّ :احسان کیا
عَلَيْهِمْ :جن پر
اَ :(تو) کیا
اللّٰهُ :اللہ
بِالشّٰكِرِيْنَ :شکر کرنے والوں کو
جَآءَكَ :آئیں آپؐ کے پاس

الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو
بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں پر
سَلٰمٌ : سلامتی ہے
کَتَبَ : لکھا (یعنی لازم کیا)
عَلٰی نَفْسِہٖ : اپنے آپ پر
اَنَّہٗ : حقیقت یہ ہے کہ
عَمِلَ : کرتا ہے
سُوْٓءًا : کوئی برائی
ثُمَّ : پھر
مِنْۢ بَعْدِہٖ : اس کے بعد
فَاَنَّہٗ : تو یہ کہ وہ
رَّحِیْمٌ : ہر حال میں رحم کرنے والا ہے
نُفَصِّلُ : ہم کھول کھول کر بتاتے ہیں
وَلِتَسْتَبِیْنَ : اور تا کہ واضح ہو جائے

یُؤْمِنُوْنَ : ایمان رکھتے ہیں
فَقُلْ : تو آپؐ کہیں
عَلَیْکُمْ : تم لوگوں پر
رَبُّکُمْ : تمہارے رب نے
الرَّحْمَۃَ : رحمت کو
مَنْ : جو
مِنْکُمْ : تم میں سے
بِجَھَالَۃٍ : نادانی سے
تَابَ : وہ توبہ کرتا ہے
وَاَصْلَحَ : اور اصلاح کرتا ہے
غَفُوْرٌ : بے انتہا بخشنے والا ہے
وَکَذٰلِکَ : اور اس طرح
الْاٰیٰتِ : نشانیوں کو
سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ : مجرموں کا راستہ

نوٹ: آیات مذکورہ سے چند ہدایات واضح ہوتی ہیں۔ اوّلاً یہ کہ کسی کی ظاہری خستہ حالی کو دیکھ کر اس کو حقیر سمجھنا درست نہیں ہے۔ بسا اوقات ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے نزدیک نہایت معزز ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ شرافت کا معیار محض دنیا کی دولت وثروت کو سمجھنا انسانیت کی توہین ہے۔ ثالثاً یہ کہ کسی قوم کے مصلح اور مبلغ کے لیے اگرچہ تبلیغ بھی ضروری ہے جس میں ماننے والے اور نہ ماننے والے سب مخاطب ہوں، لیکن ان لوگوں کا حق مقدم ہے جو ان تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ رابعاً یہ کہ جو شخص انعاماتِ الٰہیہ کی زیادتی کا طالب ہو، اس پر لازم ہے کہ قول وعمل سے شکرگزاری کو اپنا شعار بنائے۔ (معارف القرآن)

آیات ۵۶ تا ۶۰

قُلْ اِنِّیْ نُھِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَھْوَآءَکُمْ ۙ قَدْ
ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَکَذَّبْتُمْ بِہٖ ؕ مَا عِنْدِیْ
مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَھُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ
مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ
الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَآ اِلَّا ھُوَ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعْلَمُھَا وَلَا
حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾ وَھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ

بِالَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبۡعَثُكُمۡ فِيۡهِ لِيُقۡضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۰﴾

س ق ط

سَقَطَ يَسۡقُطُ (ن) سُقُوۡطًا : بلندی سے پستی میں گرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۹۔

سُقِطَ : سَقَطَ فعل لازم ہے' پھر بھی ایک محاورہ میں اس کا مجہول سُقِطَ آتا ہے' لیکن وہاں بھی معنی لازم کے دیتا ہے۔ سُقِطَ فِیۡ یَدِہٖ کا مطلب ہے لغزش کرنا' نادم ہونا۔ ﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡهِمۡ﴾ (الاعراف:۱۴۹) ''اور جب وہ لوگ پچھتائے۔''

سَاقِطٌ (اسم الفاعل) : گرنے والا۔ ﴿وَاِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا﴾ (الطور:۴۴) ''اور اگر وہ لوگ دیکھیں کوئی ٹکڑا آسمان سے گرنے والا ہوتے ہوئے۔''

اَسۡقَطَ یُسۡقِطُ (افعال) اِسۡقَاطًا: کسی کو گرانا۔ ﴿اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمۡتَ﴾ (بنی اسرائیل:۹۲) ''یا تو گرا دے آسمان کو جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا۔''

اَسۡقِطۡ (فعل امر) : تو گرا۔ ﴿فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (الشعراء:۱۸۷) ''پس تو گرا ہم پر کوئی ٹکڑا آسمان سے۔''

سَاقَطَ یُسَاقِطُ (مفاعلہ) مُسَاقَطَةً : مسلسل یا باری باری گرانا۔ ﴿وَهُزِّیۡۤ اِلَیۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَیۡكِ رُطَبًا جَنِیًّا ﴿۲۵﴾﴾ (مریم) ''تو ہلا اپنی طرف کھجور کے تنے کو تو وہ گراتا رہے گا تجھ پر تازہ پکی کھجوروں کو۔''

و ر ق

وَرَقَ یَرِقُ (ض) وَرۡقًا: درخت کا پتے دار ہونا۔

وَرَقٌ (اسم جنس) : پتے۔ واحد وَرَقَةٌ جمع اَوۡرَاقٌ۔ زیر مطالعہ آیت ۵۹۔

وَرِقٌ (اسم ذات): چاندی کا سکہ۔ ﴿فَابۡعَثُوۡۤا اَحَدَكُمۡ بِوَرِقِكُمۡ هٰذِهٖۤ﴾ (الکہف:۱۹) ''تو بھیجو اپنے میں سے ایک کو اپنے اس چاندی کے سکے کے ساتھ۔''

ر ط ب

رَطِبَ یَرۡطَبُ (س) رَطۡوۡبَةً : نمی والا ہونا' تر ہونا۔

رَطۡبٌ : نمناک یا تر چیز۔ زیر مطالعہ آیت ۵۹۔

رَطَبَ یَرۡطُبُ (ن) رَطۡبًا : کھجور کا پک جانا۔

رُطَبٌ : پکی کھجور۔ اوپر مُسَاقَطَةً میں (مریم:۲۵) دیکھیں۔

ی ب س

یَبِسَ یَیۡبَسُ (س) یَبۡسًا : کسی چیز کا خشک ہو جانا' سوکھ جانا۔

يَبْسٌ :تری کے بعد خشک ہو جانے والی چیز۔
يَبَسٌ : تری کے بعد خشک ہو جانے والی جگہ یا زمین ۔ ﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا﴾ (طٰہٰ:۷۷) ''پس آپؑ بنا دیں ان کے لیے ایک خشک راستہ سمندر میں۔''
يَابِسٌ جمع مؤنث يَابِسَاتٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت) : خشک ہونے والا' یعنی خشک۔ زیر مطالعہ آیت ۵۹۔ ﴿سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ﴾ (یوسف:۴۳) ''سات ہری بالیں اور دوسری خشک۔''

ترکیب:

(آیت ۵۷) ''بِهٖ'' میں ضمیر ''بَيِّنَةٍ'' کے لیے معنوی لحاظ سے مذکر آئی ہے' کیونکہ یہاں ''بَيِّنَةٍ'' سے مراد وحی اور قرآن مجید ہے۔ (آیت ۵۹) ''تَسْقُطُ'' واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل ''وَرَقَةٌ'' ہے جو ''مِنْ'' کی وجہ سے حالت جر میں آیا ہے۔ ''لَا حَبَّةٍ' لَا رَطْبٍ'' اور ''لَا يَابِسٍ'' ان سب میں ''لَا'' کے بعد ''تَسْقُطُ'' یا ''يَسْقُطُ'' محذوف ہے اور ''مِنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے یہ اسماء حالت جر میں آئے ہیں۔ ''فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ'' سے پہلے اس کا مبتدا اور خبر' دونوں محذوف ہیں ۔(آیت ۶۰) ''فِيْهِ'' کی ضمیر ''النَّهَارِ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہیے
اِنِّيْ : کہ
نُهِيْتُ : مجھ کو منع کیا گیا ہے
اَنْ : کہ
اَعْبُدَ : میں بندگی کروں
الَّذِيْنَ : ان لوگوں کی جن کو
تَدْعُوْنَ : تم لوگ پکارتے ہو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ
قُلْ : آپؐ کہیے
لَّآ اَتَّبِعُ : میں پیروی نہیں کروں گا
اَهْوَآءَكُمْ : تم لوگوں کی خواہشات کی
قَدْ ضَلَلْتُ : میں تو گمراہ ہو چکوں گا
اِذًا : پھر تو
وَّمَآ اَنَا : اور میں نہیں رہوں گا
مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ : ہدایت پانے والوں میں سے
قُلْ : آپؐ کہیے
اِنِّيْ : کہ میں
عَلٰى بَيِّنَةٍ : ایک واضح دلیل پر ہوں
مِّنْ رَّبِّيْ : اپنے رب (کی طرف) سے
وَكَذَّبْتُمْ : حالانکہ تم لوگوں نے جھٹلایا
بِهٖ : اس کو
مَا عِنْدِيْ : میرے پاس نہیں ہے
مَا : وہ
تَسْتَعْجِلُوْنَ : تم لوگ جلدی مچاتے ہو
بِهٖ : جس کی
اِنِ : نہیں ہے
الْحُكْمُ : حکم
اِلَّا : مگر
لِلّٰهِ : اللہ کا
يَقُصُّ : وہ بیان کرتا ہے

الْحَقَّ :حق کو
خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ :فیصلہ کرنے والوں میں بہترین ہے
لَوْ :اگر
عِنْدِیْ :میرے پاس ہوتا
تَسْتَعْجِلُوْنَ :تم لوگ جلدی مچاتے ہو
لَقُضِیَ :تو فیصلہ کر دیا جاتا
بَيْنِیْ :میرے درمیان
وَاللّٰهُ :اور اللہ
بِالظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والوں کو
مَفَاتِحُ الْغَيْبِ :غیب کی کنجیاں
اِلَّا :مگر
وَيَعْلَمُ :اور وہ جانتا ہے
فِی الْبَرِّ :خشکی میں ہے
وَمَا تَسْقُطُ :اور نہیں گرتا
اِلَّا :مگر
وَلَا :اور نہیں (گرتا)
فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ :زمین کے اندھیروں میں
رَطْبٍ :کوئی بھی تر چیز
يَابِسٍ :کوئی بھی خشک چیز
فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ :وہ ہے ایک واضح کتاب میں
الَّذِیْ :وہی ہے جو
بِالَّيْلِ :رات میں
مَا :اس کو جو
بِالنَّهَارِ :دن میں
يَبْعَثُكُمْ :وہ اٹھاتا ہے تم لوگوں کو
لِيُقْضٰٓى :تاکہ پورا کیا جائے

وَهُوَ :اور وہ
قُلْ :آپؐ کہیے
اَنَّ :یہ کہ
مَا :وہ
بِهٖ :جس کی
الْاَمْرُ :تمام معاملات کا
وَبَيْنَكُمْ :اور تمہارے درمیان
اَعْلَمُ :خوب جانتا ہے
وَعِنْدَهٗ :اور اس ہی کے پاس ہیں
لَا يَعْلَمُهَآ :نہیں جانتا ان کو
هُوَ :وہ
مَا :اُس کو جو
وَالْبَحْرِ :اور پانی میں ہے
مِنْ وَّرَقَةٍ :کوئی بھی پتا
يَعْلَمُهَا :وہ جانتا ہے اس کو
حَبَّةٍ :کوئی بھی دانہ
وَلَا :اور نہیں (گرتی)
وَّلَا :اور نہیں (گرتی)
اِلَّا :مگر
وَهُوَ :اور وہ
يَتَوَفّٰىكُمْ :پورا پورا لے لیتا ہے تم لوگوں کو
وَيَعْلَمُ :اور وہ جانتا ہے
جَرَحْتُمْ :تم لوگوں نے کمایا
ثُمَّ :پھر
فِيْهِ :اس میں
اَجَلٌ مُّسَمًّى :مقررہ مدت کو

ثُمَّ : پھر
مَرْجِعُكُمْ : تم لوگوں کے لوٹنے کی جگہ ہے
يُنَبِّئُكُمْ : وہ جتادے گا تمہیں
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : تم لوگ کیا کرتے تھے

اِلَيْهِ : اس کی ہی طرف
ثُمَّ : پھر
بِمَا : وہ جو

آیات ۶۱ تا ۶۷

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

ك ر ب

كَرَبَ يَكْرُبُ (ن) كَرْبًا : سخت غمگین ہونا۔
كَرْبٌ : شدید رنج، سخت تکلیف۔ زیر مطالعہ آیت ۶۴۔

ش ی ع

شَاعَ يَشِيْعُ (ض) شَيْعًا : کسی خبر، عقیدہ یا نظریہ کا پھیلنا اور زور پکڑنا۔ (۱) پھیلنا۔ (۲) تقویت حاصل کرنا۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (النور:۱۹) ''بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ پھیلے فحاشی ان لوگوں میں جو ایمان لائے تو ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔''

شِيَعٌ (اسم جنس) : واحد شِيْعَةٌ جمع اَشْيَاعٌ۔ کسی عقیدے یا شخصیت سے متعلق لوگ جن سے اس کو تقویت حاصل ہو۔ (۱) پیروکار (۲) گروہ، فرقہ۔ (آیت ۶۵) ﴿هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ﴾ (القصص:۱۵) ''یہ اس کے فرقے میں سے ہے اور یہ اس کے دشمنوں میں سے ہے۔'' ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشْيَاعَكُمْ﴾ (القمر:۵۱) ''اور ہم نے ہلاک کیا ہے تمہارے گروہوں کو۔''

ترکیب:

(آیت ۶۱) ''هُوَ الْقَاهِرُ'' میں ''هُوَ'' کی ضمیر مبتدا بھی ہے اور ضمیر فاصل بھی۔ ''اِذَا'' شرطیہ ہے اور اگلی آیت میں ''ثُمَّ'' اسی ''اِذَا'' سے متعلق ہے۔ اس لیے دونوں آیتوں میں افعال ماضی کا ترجمہ حال میں ہوگا۔

''تَوَفَّتْ'' واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل ''رُسُلُنَا'' عاقل کی جمع مکسر ہے اور اس کی ضمیر مفعولی ''اَحَدَکُمْ'' کے لیے ہے۔ (آیت۶۲) ''اللّٰہِ'' کا بدل ہونے کی وجہ سے ''مَوْلٰھُمْ'' کا مضاف ''مَوْلٰی'' حالت جر میں ہے اور ''اَلْحَقِّ'' اس کی صفت ہے ۔ (آیت۶۳) ''مَنْ'' استفہامیہ ہے۔ ''تَدْعُوْنَہٗ'' کی ضمیر ''مَنْ'' کے لیے ہے۔ ''تَضَرُّعًا'' اور ''خُفْیَۃً'' حال ہیں۔ ''ھٰذِہٖ'' کا اشارہ ''ظُلُمٰتِ'' کی طرف ہے۔ (آیت۶۴) ''مِنْھَا'' کی ضمیر بھی ''ظُلُمٰتِ'' کے لیے ہے۔ (آیت ۶۵) ''اَنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''یَلْبِسَ'' اور ''یُذِیْقَ'' حالت نصب میں آئے ہیں۔ (آیت ۶۷) ''مُسْتَقَرٌّ'' اسم المفعول ہے جو ظرفِ زماں کے طور پر ہے۔

ترجمہ:

وَھُوَ : اور وہ	اَلْقَاھِرُ : غالب ہے
فَوْقَ عِبَادِہٖ : اپنے بندوں پر	وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ : اور تم پر بھیجتا ہے
حَفَظَۃً : نگران (فرشتے)	حَتّٰٓی اِذَا : یہاں تک کہ جب
جَآءَ : آتی ہے	اَحَدَکُمُ : تمہارے کسی ایک کو
اَلْمَوْتُ : موت	تَوَفَّتْہُ : تو پورا پورا لے لیتے ہیں اس کو
رُسُلُنَا : ہمارے رسول (یعنی فرشتے)	وَھُمْ : اور وہ
لَا یُفَرِّطُوْنَ : کوتاہی نہیں کرتے	ثُمَّ : پھر
رُدُّوْٓا : ان کو لوٹایا جاتا ہے	اِلَی اللّٰہِ : اللہ کی طرف
مَوْلٰھُمُ الْحَقِّ : جو ان کا حقیقی آقا ہے	اَلَا : سن لو
لَہُ : اس ہی کا ہے	اَلْحُکْمُ : تمام حکم
وَھُوَ : اور وہ	اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ : حساب لینے والوں میں تیز ترین ہے
قُلْ : آپؐ کہیے	مَنْ : کون
یُّنَجِّیْکُمْ : تم لوگوں کو نجات دیتا ہے	مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ : پانی اور خشکی کے اندھیروں سے
تَدْعُوْنَہٗ : تم لوگ پکارتے ہو جس کو	تَضَرُّعًا : گڑگڑاتے ہوئے
وَّخُفْیَۃً : اور چپکے چپکے	لَئِنْ : (کہ) بے شک اگر
اَنْجٰنَا : وہ نجات دے ہم کو	مِنْ ھٰذِہٖ : اس سے
لَنَکُوْنَنَّ : تو ہم لازماً ہو جائیں گے	مِنَ الشّٰکِرِیْنَ : شکرگزاروں میں سے
قُلِ : آپؐ کہیے	اَللّٰہُ : اللہ

يُنَجِّيْكُمْ : نجات دیتا ہے تم کو
وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ : اور ہر ایک دکھ سے
اَنْتُمْ : تم لوگ
قُلْ : آپؐ کہیے
عَلٰٓى : اس پر
يَّبْعَثَ : وہ بھیج دے
عَذَابًا : کوئی عذاب
اَوْ : یا
اَوْ يَلْبِسَكُمْ : یا وہ تم لوگوں کو بھڑا دے
وَّيُذِيْقَ : اور وہ مزا چکھا دے
بَاْسَ بَعْضٍ : بعض کی جنگ کا
كَيْفَ : کیسے
الْاٰيٰتِ : نشانیوں کو
يَفْقَهُوْنَ : سمجھیں
بِهٖ : اس کو
وَ : حالانکہ
قُلْ : آپؐ کہیے
عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر
لِكُلِّ نَبَاٍ : ہر ایک خبر کے لیے
وَّسَوْفَ : اور عنقریب

مِّنْهَا : اس سے
ثُمَّ : پھر (بھی)
تُشْرِكُوْنَ : شریک کرتے ہو (دوسروں کو)
هُوَ الْقَادِرُ : وہی قدرت رکھنے والا ہے
اَنْ : کہ
عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر
مِّنْ فَوْقِكُمْ : تمہارے اوپر سے
مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ : تمہارے قدموں کے نیچے سے
شِيَعًا : فرقہ فرقہ ہوتے ہوئے
بَعْضَكُمْ : تمہارے بعض کو
اُنْظُرْ : (تو) دیکھو
نُصَرِّفُ : ہم بار بار بیان کرتے ہیں
لَعَلَّهُمْ : شاید کہ وہ
وَكَذَّبَ : اور جھٹلایا
قَوْمُكَ : آپؐ کی قوم نے
هُوَ الْحَقُّ : وہی حق ہے
لَسْتُ : میں نہیں ہوں
بِوَكِيْلٍ : کوئی نگران
مُّسْتَقَرٌّ : ایک وقت ہے
تَعْلَمُوْنَ : تم لوگ جان لوگے

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝
وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سورۃ الاخلاص کی فضیلت

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلٰی سَرِیَّةٍ فَکَانَ یَقْرَأُ لِاَصْحَابِہٖ فِیْ صَلَاتِھِمْ فَیَخْتِمُ **بِقُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ**، فَلَمَّا رَجَعُوْا ذُکِرَ ذٰلِکَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ : ((**سَلُوْہُ لِاَیِّ شَیْءٍ یَصْنَعُ ذٰلِکَ؟**)) فَسَاَلُوْہُ ، فَقَالَ : لِاَنَّھَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَقْرَاَ بِھَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((**اَخْبِرُوْہُ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُحِبُّہٗ**)) (۱)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب کو لشکریوں کا امیر بنا کر کسی سریہ میں بھیجا۔ وہ جب اپنے ساتھیوں کی امامت کراتے تھے تو ہر نماز کی آخری رکعت میں **قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد** (یعنی سورۃ الاخلاص) ہی پڑھا کرتے تھے۔ جب وہ دستہ واپس آیا تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی وجہ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان ہے' اس لیے مجھے یہ محبوب ہے کہ میں اس سورت کو زیادہ سے زیادہ پڑھوں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو بتا دو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس کو محبوب رکھتے ہیں۔''

چار آیات پر مشتمل سورۃ الاخلاص قرآن مجید کی عظیم ترین سورت ہے۔ توحید و رسالت اور آخرت' دین اسلام کے تین اہم ترین عقائد ہیں' جبکہ سورۃ الاخلاص ان تین میں سے ایک یعنی توحید باری تعالیٰ کی وضاحت میں جامع ترین سورت ہے۔ اسی لیے اس کو تہائی قرآن کہا گیا ہے۔

بخاری شریف (کتاب الصلاۃ) کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جس صحابی کو قبا میں نماز کا امام مقرر کیا گیا انہیں سورۃ الاخلاص اس قدر محبوب تھی کہ وہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ سورۃ الاخلاص ضرور پڑھتے تھے۔ جب نمازیوں نے انہیں اس طریقے سے روکا تو انہوں نے کہا کہ میں تو ایسے ہی کروں گا' اگر تم چاہو تو کسی اور کو امام مقرر کر لو۔ مگر یہ صاحب ان سب میں زیادہ افضل تھے۔ امام کے اس طریقے کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دی گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سے پوچھو' وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس سورت سے بڑی محبت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی محبت تمہیں جنت میں پہنچا دے گی''۔ یہ صاحب سورۃ الاخلاص کی محبت میں اس قدر شدید تھے کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ یا تو صرف سورۃ

(۱) صحیح البخاری' کتاب التوحید' باب ما جاء فی دعاء الخیر امتہ الی توحید اللّٰہ تبارک وتعالیٰ۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل قراءۃ قل ھو اللّٰہ احد۔

الاخلاص پڑھا کرو یا کوئی اور سورت تو انہوں نے کہا کہ میں تمہاری امامت تو چھوڑ سکتا ہوں مگر سورۃ الاخلاص کی تکرار چھوڑنا مجھے گوارا نہیں۔

سورۃ الاخلاص کے بہت فضائل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ترغیب کے زیر اثر اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رات کو سوتے وقت ضرور اس کی تلاوت کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس سورت کو دس مرتبہ پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک محل تعمیر کر دے گا''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! پھر تو ہم بہت سے محل بنوالیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اور اس سے بھی اچھا دینے والا ہے۔'' (مسند احمد)

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جمع ہو جاؤ' آج میں تمہیں ایک تہائی قرآن سناؤں گا۔ لوگ جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ گھر سے تشریف لائے اور آ کر سورۃ الاخلاص پڑھی اور پھر گھر تشریف لے گئے۔ اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں باتیں ہونے لگیں کہ وعدہ تو آپؐ نے ایک تہائی قرآن سنانے کا کیا تھا' مگر آپؐ صرف سورۃ الاخلاص پڑھ کر چلے گئے۔ شاید وحی آ گئی ہو۔ اتنے میں آپ ﷺ پھر تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے تم سے ایک تہائی قرآن سنانے کا وعدہ کیا تھا اور میں نے سورۃ الاخلاص سنا کر اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ سنو! یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے''۔ (ترمذی) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس سے عاجز ہو کہ ہر دن میں ایک تہائی قرآن پڑھ لیا کرو؟ لوگوں نے عرض کیا: حضور ﷺ ہم اس سے واقعی عاجز اور ضعیف ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سنو' اللہ تعالیٰ نے قرآن کے تین حصے کیے ہیں' قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ .....الخ تیسرا حصہ ہے۔''

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کہیں سے تشریف لا رہے تھے اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپؐ نے ایک شخص کو اس سورۃ کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: ''واجب ہو گئی''۔ حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا: کیا واجب ہو گئی؟ آپؐ نے فرمایا: ''جنت''۔ (ترمذی ونسائی) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میدانِ تبوک میں تھے۔ سورج ایسی روشنی اور شعاعوں کے ساتھ نکلا کہ ہم نے اس سے پہلے اتنا شفاف' روشن اور منور سورج نہیں دیکھا تھا۔ اسی وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ آج سورج کی اس تیز روشنی' زیادہ نور اور چمکیلی شعاعوں کی کیا وجہ ہے؟ جبریلؑ نے جواب دیا کہ آج مدینہ میں حضرت معاویہ بن معاویہؓ کا انتقال ہو گیا ہے جن کے جنازے کی نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتے آسمان سے بھیجے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ ان کے کس عمل کے باعث ہوا؟ فرمایا: وہ سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ.....دن رات' چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے پڑھا کرتے تھے۔ اگر آپؐ کا ارادہ ہو تو میں زمین سمیٹ لوں اور آپؐ ان کے جنازے کی نماز ادا کر لیں؟ آپؐ نے فرمایا: بہت اچھا۔ پس آپؐ نے ان کے جنازے کی نماز ادا کر لی۔ (مسند ابویعلیٰ) ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب آپؐ نے نماز جنازہ پڑھنا چاہا تو جبریلؑ نے اپنا پر زمین پر مارا جس سے تمام درخت اور سب ٹیلے پست ہو گئے اور ان کا

جنازہ حضور ﷺ کو نظر آنے لگا۔ آپؐ نے نماز شروع کی اور آپؐ کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں تھیں‘ ہر صف میں ستر ہزار فرشتے تھے۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ آخر اس مرتبہ کی کیا وجہ ہے؟ حضرت جبریلؑ نے فرمایا: یہ ان کی اس سورت کے ساتھ محبت تھی۔ وہ ہر وقت آتے جاتے‘ اٹھتے بیٹھتے اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

سورۃ الاخلاص کی یہ فضیلت اس لیے ہے کہ یہ خالق کائنات کے تعارف پر مشتمل ہے اور توحید باری تعالیٰ کا جامع عنوان ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہر شخص توحید الٰہی پر کامل یقین رکھے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو خالق کائنات تسلیم کرے‘ اس کو بے مثل اور بے مثال مانے۔ اس کو ہر کمزوری سے مبرا سمجھے۔ یقین رکھے کہ وہ بے نیاز ہے اور مخلوق کا ہر فرد اس کا محتاج اور نیاز مند ہے۔ نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ وہ اکیلا ہے۔ وہ معبود ہے اور باقی سب انسان‘ حیوان اور تمام چیزیں اس کی مخلوق ہیں۔ عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔ ہر طرح کی عبادتیں صرف اسی کے لیے ہیں۔ اپنی ضرورتوں‘ حاجتوں اور دعاؤں کے لیے اس کے سوا کسی دوسری ہستی کے سامنے ہاتھ پھیلانے والا توحید سے نابلد ہے اور اسے سورۃ الاخلاص کا فہم نہیں ہے۔ سورۃ الاخلاص کو سمجھ کر پڑھنے والا اور اس کے تقاضوں کو جان کر اس کے ساتھ محبت کرنے والا واقعی اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ اس سورت پر یقین شرک کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور شرک وہ بدترین گناہ ہے کہ جس کی بخشش کے لیے کسی بڑے سے بڑے مقرب کا استغفار بھی قبول نہیں۔ قرآن گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر کسی کے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ سورۃ الاخلاص کا فہم وہ چیز ہے جو بشری تقاضے کے تحت ہونے والے گناہوں کی بخشش کا سبب بھی بن جاتا ہے۔

❁❁❁

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے　　اشاعتِ عام: 35 روپے

قرآن کریم اور فطرتِ انسانی

نذیر احمد علائی☆

کلمہ طیبہ اور فطرتِ اسلامی (انسانی) کو وحی الٰہی اوپر اُٹھاتی اور صحیح سمت دیتی ہے‘ بالفاظِ دیگر کلمہ طیبہ کو نیک اعمال اُوپر اُٹھاتے ہیں‘ ترقی دیتے ہیں‘ بمصداق: ﴿اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ ؕ﴾ (فاطر:۱۰) ’’اُسی کی طرف اٹھتی ہیں اچھی باتیں اور عملِ صالح اسے اوپر اٹھاتا ہے‘‘۔ یعنی کلمہ طیبہ کو عروج پر پہنچانے کے لیے عمل صالح درکار ہے‘ اس کے بغیر یہ ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔

فطرت کیا ہے؟

فطرت کے کئی وجوہ ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۪ۙ﴿۷﴾ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۪ۙ﴿۸﴾﴾ (الشمس) ’’اور قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔ پس اس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا‘‘۔ یعنی مبدءِ نفس کے لحاظ سے انسان کی فطرت میں نیکی و بدی کا جذبہ ودیعت ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: نیک فطرت اور بد فطرت‘ ایسے ہی باایمان اور بے ایمان‘ دین دار اور بے دین وغیرہ‘ جیسا کہ باری تعالیٰ خود فرماتا ہے: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۪ۙ﴿۹﴾ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ﴿ؕ۱۰﴾﴾ (الشمس) ’’یقیناً کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا۔ اور ناکام ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا‘‘۔ یعنی جس نے اس نفس کو سنبھال کر رکھا اس نے کامیابی پائی اور جس نے اس نفس کی امانت میں خیانت کی وہ ناکام و نامراد ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ بدی نفس خلقت میں نہیں‘ بلکہ آگے کے مرحلہ یعنی امانت نفس میں اس کا صدور ہو سکتا ہے‘ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِیۡكُمۡ نَارًا﴾ (التحریم:۶) ’’اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے بچانے کی کوشش کرو‘‘۔ یہ نفس امانت ہے‘ اس لیے اس کی دیکھ بھال کرنا انسان پر لازم ہے۔ یہ نفس کیا ہے‘ اس کی ماہیت کیا ہے؟ درحقیقت انسان کی خودارادیت‘ خودمختاری اور اپنی مرضی کا مالک ہونے کی بنا پر نیکی و بدی کا صدور ہوتا ہے اور اس روش کو نفسانیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا دونوں کا مبدء نفس ہے۔ نفسِ فطرت میں سب توحیدِ الٰہی پر ہیں اور نفسِ فطرت میں کوئی بد نہیں ہے۔ نفس فطرت میں انسان کے اندر توحید ہی کا رجحان ہے۔ بدی اور شرک کا رجحان امانت نفس کے ساتھ اجراء ہوا‘ لیکن اس کے ساتھ اس نفس کو اللہ تعالیٰ نے یوں ہی بے لگام نہیں چھوڑا‘ بلکہ اس کے لیے ایک محافظ مقرر کیا‘ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡهَا حَافِظٌ ﴿ؕ۴﴾﴾ (الطارق) ’’کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو‘‘۔ اس طرح دین انسان کی فطرت میں ودیعت ہے‘ گویا یہ کوئی خارجی چیز نہیں ہے‘ بلکہ عین فطرتِ انسانی یعنی

☆ ریسرچ سکالر‘ شعبہ دینیات‘ سنی‘ مسلم یونیورسٹی‘ علی گڑھ

اپنے باطن کا خزانہ ہے جو اس کی شخصیت میں ہمیشہ پنہاں رہتا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک صفحہ سادہ اور تمام تر اپنے ماحول کی پیداوار و عادات کی مخلوق نہیں ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود فطرتِ انسانی کو بہترین کہا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴﴾ (التین) ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا''۔مگر انسان کی یہ فطرت حیوانوں کی جبلّت کی طرح نہیں ہے' کہ وہ اس سے انحراف نہ اختیار کر سکے' بلکہ انسان اپنے اندر اختیار بھی رکھتا ہے۔اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کے لیے انبیاء و رُسل علیہم السلام بھیجے۔ان کی تعلیمات چونکہ انہی مبادیات پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر مضمر ہیں اس بنا پر جو سلیم الطبع تھے' انہوں نے ان انبیاء و رُسل کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھا' کیونکہ انسان کی فطرت میں اللہ کی بندگی ہے' بفحوائے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذاریات) ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں''۔گویا اس طرح انسان کی ساخت اور فطرت کبھی نہیں بدل سکتی' یعنی نہ انسان عبد سے غیر عبد بن سکتا ہے نہ کسی غیر اللہ کو اللہ بنا لینے سے وہ فی الحقیقت اس کا اِلٰہ بن سکتا ہے۔انسان چاہے کتنے ہی معبود بنا بیٹھے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل طے شدہ ہے کہ وہ ایک اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے' مثلاً فرعون جیسے مغرور بادشاہ نے بھی آخری وقت میں اللہ ہی کو پکارا۔از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۹۰ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۹۱﴾ (یونس)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو پار اتار دیا سمندر (یا دریا) کے' پھر ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس کے لشکروں نے سرکشی اور زیادتی کی غرض سے۔یہاں تک کہ جب پا لیا اُسے غرق نے' کہنے لگا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اُس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں' اور میں (اُس کے) فرماں برداروں میں سے ہوں۔کیا اب (تو ایمان لا رہا ہے)؟ حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔''

یہ اُس کی فطرت کی آواز تھی' جو اُس نے دنیا میں دبا کر رکھی تھی۔اس آواز کی ایک نمایاں شکل یہ ہے' بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾ (القیامة) ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس لوامہ کی''۔جب کہ قرآن حکیم میں اس نفس کا دوسرا وطیرہ یا پہلو یہ بیان ہوا ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۵۳﴾ (یوسف) ''(اس عورت نے کہا) اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتی' یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اُس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے۔یقیناً میرا ربّ بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہے''۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو جیسا بنایا اس میں تبدیلی یا انحراف قطعاً روا نہیں ہے۔فطرت سے انحراف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عورت مرد بننے کی خواہش مند ہو جائے اور مرد عورت جیسا حلیہ اختیار کر لے' یہ طرزِ حیات بالکل فطرت کے خلاف ہے۔نیز اللہ فرماتا ہے کہ انسان کی نشأۃ نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ﴿۹۸﴾﴾ (الانعام)

''اور وہی ہے جس نے تمہیں اٹھایا ایک جان سے' پھر تمہارے لیے ایک تو مستقل ٹھکانہ ہے اور ایک کچھ دیر (امانتاً) رکھے جانے کی جگہ۔ ہم نے تو اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ سے کام لیں۔''

مختلف تفاسیر میں فطرت کا مفہوم

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴿۳۰﴾﴾ (الروم)

''اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر (قائم رہو) جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی ہے سیدھا دین' لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

مذکورہ آیت کے سلسلے میں علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ فطرۃ کے لغوی معنی خلقت' ابتداء اور اختراع کے ہیں' جیسے ارشاد ہوا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (فاطر:۱) ''کُل حمد اور کُل شکر اللہ کے لیے ہے جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔''

﴿وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴿۲۲﴾﴾ (یٰسٓ) ''اور مجھے کیا ہے کہ میں عبادت نہ کروں اُس ہستی کی جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹا دیے جاؤ گے۔''

﴿اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ﴿۲۷﴾﴾ (الزخرف) ''سوائے اُس ہستی کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' تو یقیناً وہی مجھے راستہ دکھائے گا۔''

اور اصطلاحی معنی یہ ہے اِتَّبِعْ فِطْرَةَ اللّٰه یعنی فطرت اللہ کی پیروی کرو۔[۱]

علامہ آلوسیؒ رقمطراز ہیں: اِتَّبِعْ فِطْرَةَ اللّٰه یعنی اتَّبِعِ الدِّین۔ پھر طیبیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ معنی نظم قرآن سے اَقرب ہے۔ اس قول باری کے موافق ہے: ﴿بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۚ﴾ (الروم:۲۹)۔[۲] ''بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان ظالموں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے بغیر کسی علم کے''۔

ابن جریرؒ بھی فِطْرة اللّٰه سے دین مراد لیتے ہیں۔[۳] علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بہائم کی فطرت تبدیل نہ ہوگی۔[۴] ابن جریرؒ بھی بہائم کے قائل ہیں۔[۵] ابن کثیرؒ نے اس بات کو یوں بیان کیا' کہ ہر انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کے ساتھ لازم وملزوم ہے' اسی پر تمام انسان پیدا کیے گیے ہیں' کیونکہ اللہ نے انسان کو اپنی معرفت وتوحید کی خاطر پیدا کیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے' یہ اقرار اس آیت میں موجود ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ

﴿بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف)

''اور یاد کرو جب نکالا آپؑ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر' (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ مبادا تم یہ کہو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔''

آپ مزید رقمطراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کے مابین مساوی ہے' اس لیے کہ لوگ فطرت میں جبلت مستقیمہ پر ہیں' یعنی ہر ایک کی ولادت ایک ہی فطری اصول پر ہوتی ہے' یعنی جبلی اصول پر' جس میں کوئی تفاوت نہیں' اس میں سب کی خلقت یکساں ہے۔(۶)

علامہ اقبالؒ نے اس بات کو شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

فطرت کا مفہوم: قرآن کی روشنی میں

فطرت کے اصل معنی خلقت یعنی پیدائش کے ہیں اور یہی اسلام و توحید ہے۔(۷) مطلب یہ ہے کہ سب کی پیدائش بلاتفریق مسلم و کافر' اسلام و توحید پر ہوئی ہے۔ قرآن میں آیا ہے:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم)

''اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر (قائم رہو) جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) (۸) ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

یعنی ایمان باللہ اور اسلام پر۔(۹)

ابن زید کہتے ہیں کہ اسلام پر پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدمؑ سے اپنے ربّ ہونے کا اقرار لیا' جس کا ثبوت ان آیات میں مذکور ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف)

''اور یاد کرو جب نکالا آپؑ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر' (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ مبادا تم یہ کہو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔''

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴿۲۱۳﴾ (البقرۃ)(۱۰)

''تمام انسان ایک ہی اُمت تھے۔تو اللہ نے (اپنے) نبی بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے۔اور ان کے ساتھ (اپنی) کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ' تاکہ وہ فیصلہ کردے لوگوں کے مابین ان امور میں جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔اور کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جنہیں یہ دی گئی تھی' اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن ہدایات آ چکی تھیں' محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔پس اللہ نے ہدایت بخشی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اُس حق کے معاملے میں جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا' اپنے حکم سے۔اور اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

اگرچہ حقیقت میں عقل وفطرت اور دین میں منافات نہیں ہے' بلکہ دین تو ان کو اُجاگر کرتا ہے' اوپر اُٹھاتا ہے اور اصولی شکل دیتا ہے اور زندگی کا پورا نظام ان پر استوار کرتا ہے' تو ان میں منافات کیسے ہوسکتی ہے؟ لہٰذا ہر وہ چیز جو عقل وفطرت کے منافی ہوگی دین کے بھی منافی ہوگی۔اس اصول کو شیخ محمد عبدہٗ نے یوں بیان فرمایا کہ اللہ نے جو چیزیں تمام لوگوں کو ہبہ کیں وہ ہیں: (۱) وجدان' الہام اور فطرت (۲) حواس (۳) عقل (۴) دین۔جیسے فرمایا: ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴿۱۰﴾﴾ (البلد) ''اور ہم نے اس کو راہ دکھلا دی دو گھاٹیوں کی''۔''النجدَین'' کے معنی سعادت وشقاوت اور خیر وشر کے ہوتے ہیں۔دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (فصّلت/حٰمٓ السجدۃ:۱۷) ''اور جو قومِ ثمود تھی' ان کو ہم نے ہدایت کی راہ دکھائی' لیکن انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کو ہی پسند کیا''۔مذکورہ بالا آیات میں ہدایت سے مراد دلالت (رہنمائی) ہے' مگر اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (الانعام:۹۰) ''یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی' تو آپ بھی ان کی ہدایت کی پیروی کیجیے''۔یہ آیت کسی نمونہ کی طرف اشارہ کررہی ہے' اور وہ نمونہ یہ ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴿۶۹﴾﴾ (النساء) ''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے''۔معلوم ہوا کہ عمل کی صحیح سمت کی طرف رہنمائی کرنے کا اختیار بھی اللہ ہی کو حاصل ہے۔(۱۱)

اس صورت میں محسوس کیا جاتا ہے کہ راہِ راست اختیار کرنے والے لوگوں کی سوجھ بوجھ اور پرہیزگاری بڑھتی چلی جاتی ہے' جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ﴿۱۷﴾﴾ (محمد) ''اور وہ لوگ جو ہدایت پر ہیں اللہ نے ان کی ہدایت میں اور اضافہ کردیا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرمایا ہے''۔اور یہ راہ راست نبیوں کی پیروی اور کتب سماوی کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے۔اس کی تائید درج ذیل آیات سے ہوتی ہے: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى﴿۱۲۳﴾﴾ (طٰہٰ) ''تو جب بھی تمہارے پاس آئے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو نہ وہ بہکے گا اور نہ ناکام ہوگا''۔﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۳۸﴾﴾

(البقرۃ) ''تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے''۔ ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾﴾ (النجم) ''جب کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے مکمل ہدایت آ چکی ہے''۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿٣٢﴾﴾ (محمد) ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور جو روکتے رہے دوسروں کو اللہ کے راستے سے اور وہ رسولؐ کی مخالفت میں سرگرم رہے اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہو چکی تھی' وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اور وہ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا''۔ اس طرح جو اس ہدایت کا اتباع کرے' اُس پر سلامتی ہے۔ فحوائے: ﴿وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾﴾ (طٰہٰ) ''اور سلامتی اُن پر ہے جو ہدایت کا اتباع کریں۔''

گویا خلقت کے اعتبار سے' اللہ تعالیٰ نے ہر فردِ انسانی کی فطرت' قبولِ حق کے لیے مستعد بنائی ہے اور قبولِ حق کا بیج اس کے دل میں ودیعت کر رکھا ہے۔ اب اس کو محفوظ رکھنا انسان کی اپنی ذمہ داری ہے' جیسے سختی اور خوف کے وقت اس قبولِ حق یعنی قبولِ فطرت کا اظہار ہر ایک کو ہو جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا سرکش مصیبت میں گھر کر اللہ واحد ہی کو پکارنے لگتا ہے' اُس وقت جھوٹے سہارے ذہن سے نکل جاتے ہیں' وہی سچا مالک یاد رہ جاتا ہے جس کی طرف فطرتِ انسانی ہمیشہ رہنمائی کرتی تھی۔ لہٰذا جو لوگ اس خیال میں مگن ہیں کہ اپنے ٹھہرائے ہوئے اصول وعقائد پر' خواہ وہ کتنے ہی مہمل کیوں نہ ہو' ایسے فریفتہ ہیں کہ انہیں غلطی کے امکان کا تصور بھی نہیں ہوتا' وہ بھی مشکل وقت میں اپنی فطرت کی آواز پر لبیک کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں اس فطرتِ انسانی کا ذکر ہے: ﴿بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿٤١﴾﴾ (الانعام) ''بلکہ (مصیبت کی گھڑی میں) تم اسی کو پکارتے ہو' پھر اگر وہ چاہتا ہے تو جس تکلیف کے لیے تم اسے پکارتے ہو وہ دُور کر دیتا ہے اور (ایسے مواقع پر) تم بھول جاتے ہو اُن کو جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو''۔ یعنی اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں بھی جب انسان گھر جاتا ہے تو مجبور ہو کر اسی اللہ وحدہ لاشریک کو پکارتا ہے۔ سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہے: ﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾ (العنکبوت)[12] ''سو جب یہ لوگ سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو پکارتے ہیں اللہ کو اُس کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ پھر جب وہ انہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف تو جبھی وہ شرک کرنے لگتے ہیں''۔ شبیر احمد عثمانیؒ علامہ طیبیؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ سخت مصائب میں مشرکین اللہ ہی کو یاد کرتے ہیں' دوسرے معبودوں کو بھول جاتے ہیں' تو پھر فطرت وضمیر کی اس شہادت کو امن واطمینان کے وقت کیوں یاد نہیں رکھتے؟ جیسے ارشاد ہوا: ﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ (النمل)[13] ''بھلا کون ہے جو سنتا ہے ایک مجبور ولاچار کو جب وہ اس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے؟ اور جو تمہیں جانشین بناتا ہے زمین میں؟ کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ (ان کاموں میں شریک)؟ بہت ہی کم نصیحت ہے جو تم لوگ حاصل کرتے ہو''۔ مزید فطری اصولوں کی طرف یہاں اشارہ ہے: ﴿وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ

رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ﴿۳۳﴾﴾ (الروم)(۱۴) ''اور جب انسانوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ پکارتے ہیں اپنے رب کو اُسی کی طرف رجوع کرتے ہوئے' پھر جب وہ انہیں اپنی طرف سے رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو جبھی ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔''

درحقیقت قرآن کریم دین اسلام کے اصول اور ایک صحیح فکر دے رہا ہے۔ اصولِ دین میں تمام انبیاء متفق رہے ہیں اور جو ان اصولوں سے آگے فروعات کو بھی اصولی درجہ دے' ان پر ریجھ جائے' یعنی یہ سمجھ بیٹھے کہ جو ان کے پاس ہے بس وہی صحیح ہے تو اس سلسلہ میں نبی ﷺ کو تسلی دی گئی: ﴿وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ﴿۵۲﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ﴿۵۴﴾﴾ (المؤمنون)(۱۵) ''اور یقیناً یہ تمہاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں' بس تم میرا ہی تقویٰ اختیار کرو! لیکن لوگوں نے اپنے معاملے کو اپنے مابین تقسیم کر لیا ٹکڑے کر کے۔ ہر گروہ کے لوگ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر اِترا رہے ہیں۔ تو (اے نبی ﷺ!) آپ انہیں چھوڑ دیجیے ان کی مدہوشی میں' ایک وقت تک کے لیے''۔ گویا جس طرح اللہ کے اختیار میں انسان کی فطرت ہے' اسی طرح اللہ ہی کے دست قدرت میں انسان کی ہدایت بھی ہے' ارشادِ باری ہے: ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۷۳) ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اصل ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے''۔ یعنی اصل ہدایت تو اللہ کی عطا کردہ ہدایت ہے' یہ کسی خاص گروہ اور خاص نسل کی وراثت نہیں ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ﴾ (الانعام:۷۱) ''کہہ دیجیے یقیناً اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے''۔ حتیٰ کہ ہدایت کے نشانات بھی اللہ نے طے کر دیے ہیں' مثلاً خانہ کعبہ ہدایت کا ذریعہ ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۹۶﴾﴾ (آل عمران) ''یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا (اللہ کی عبادت کے لیے) وہی ہے جو مکہ میں ہے' برکت والا ہے اور ہدایت (کا مرکز) ہے تمام جہان والوں کے لیے''۔ دوسری آیت میں ''نجوم'' کا ذکر ہوا کہ ان سے انسان راستہ معلوم کر لے' چاہے براہ راست یا قطب نما کے ذریعہ۔ ارشادِ باری ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴿۹۷﴾﴾ (الانعام) ''اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ پاؤ۔ ہم نے تو اپنی نشانیاں تفصیل سے بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

اختلاف میں انقلاب

اختلاف کو سمجھنا اور اس میں صحیح راستہ اختیار کرنا یہ انسانی زندگی اور فکر کا ایک جزء ہے' جیسے انسان کا لسانی اختلاف اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ﴿۲۳﴾﴾ (الروم)

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا فرق۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔''

اور ایک قول میں وحدت کی طرف اشارہ ہے کہ آیاتِ آفاقی وانفسی اللہ رب العزت کے یکتا وتنہا ہونے پر دلالت کرتی ہیں: وفی کلّ شیء له آیة تدلُّ علیٰ انّه واحد۔ گویا اختلاف میں بھی وحدت پنہاں ہے۔ اصل میں انسان کو صرف اپنے علم کی حد تک حقیقت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ غیر محسوس حقائق کو بھی قبول کرنا اور تسلیم کرنا چاہیے' جیسے ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ۝۷۵﴾ (المؤمن)

''یہ سب اس لیے ہوا کہ تم زمین میں ناحق اتراتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم اکڑا بھی کرتے تھے۔''

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝۸۳﴾ (المؤمن)

''تو جب آ گئے ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر تو وہ اتراتے رہے اسی پر جو بھی علم ان کے پاس تھا اور گھیرے میں لے لیا انہیں اُسی چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔''

حسنِ عمل

حسن عمل میں وسعت فکر موجود ہے' جیسے: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۝۷﴾ (الکھف) ''یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار''۔ مذکورہ آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا کی رونق پر حسن عمل کی خاطر امتحان میں ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا، فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ، فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ)) (۱۶)

''یقیناً دنیا بڑی شیریں اور بڑی سرسبز ہے' اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں اختیار بخشا ہے' پس وہ دیکھتا ہے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ پس دنیا سے بچو اور (خاص طور پر) عورتوں سے بچ کر رہو' اس لیے کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والا اوّلین فتنہ عورتوں میں ہی تھا۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے زوال کی بھی خبر دی' یعنی یہ دنیا اپنے اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا۝۸﴾ (الکھف) ''اور یقیناً ہم بنا کر رکھ دیں گے جو کچھ اس (زمین) پر ہے اسے ایک چٹیل میدان''۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ آیت کے ضمن لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو احکام دے کر جانچنا چاہتا ہے' لیکن یہ جانچ صرف بغرضِ اظہار ہے نہ کہ بغرضِ تحصیل علم۔ پس جب اللہ ان کا حقیقی مالک ومربّی ہو کر ان پر جبر نہیں کرتا تو انسان کو ایسی کیا پڑی ہے کہ ان کے رنج میں ناحق ملولِ خاطر ہو رہا

ہے۔[17] سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ایک عارضی زینت ہے جو محض انسان کو آزمائش میں ڈالنے کے لیے مہیا کی گئی ہے۔[18] مزید اس موضوع (حسن عمل) کے تعلق سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ قلبِ سلیم لے کر آئیں وہی اس آزمائش میں کامیاب ٹھہریں گے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝﴾ (الشعراء)

''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے۔ سوائے اُس کے جو آئے اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر۔''

﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝﴾ (الصّٰفّٰت)

''اور اُسی کی جماعت میں سے ابراہیمؑ بھی تھا۔ جب وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا قلبِ سلیم کے ساتھ۔''

انسان کی فطرت میں خود پسندی

یعنی مرد کی خود پسندی جو اس کے اندر فخر و عظمت کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ ارشاد باری ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝﴾ (النساء) ''اللہ بالکل پسند نہیں کرتا اُن لوگوں کو جو شیخی خورے اور اکڑنے والے ہوں''۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مذکورہ آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس کے مزاج میں تکبر و خود پسندی ہوتی ہے وہ ان حقوق کو (جو آیت میں مذکور ہیں) ادا نہیں کرتا' سو اس سے احتراز رکھو اور حذر رہو۔[19] اور عورت کی خود پسندی جو اس کو ذاتی آرائش و نمائش کی طرف لے جاتی ہے۔ ارشاد باری ہے: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝﴾ (الزخرف) ''کیا وہ جو پرورش پاتی ہے زیور میں اور بحث میں اپنا موقف واضح نہیں کر سکتی''۔ اللہ تعالیٰ نے زیور کو عورت کے لیے فطری چیز قرار دیا۔ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ لڑکی جو عادتاً آرائش و زیبائش میں نشو و نما پاتی اور زیورات وغیرہ کے شوق میں مستغرق رہتی ہے' جو دلیل ہے ضعف رائے و عقل کی اور وہ بوجہ ضعف قوتِ فکریہ کے مباحثہ کے وقت قوتِ بیانیہ بھی نہ رکھے۔[20] ان دونوں یعنی مرد و عورت کے اندر یہ جذبات و احساسات پیدائشی یعنی فطری طور پر موجود ہیں' مگر یہ جذبات صرف آزمائش کے لیے ہیں' لہٰذا خیر اس میں ہے کہ ان دونوں کے اندر یہ کمزوری پیدائشی یعنی فطری ہونے کے ساتھ ساتھ' ان پر کنٹرول کیا جائے اور آرائش و نمائش کے بجائے سادگی اور شائستگی اختیار کی جائے' فخر و عظمت کے بجائے انکسار و تواضع اختیار کیا جائے اور انسانی خدمات کو اپنا دستورِ حیات بنایا جائے۔

فکر کی اصلاح

فکری و عملی اصلاح کا مسئلہ قرآن کریم نے پہلے سے طے کر کے رکھا ہے' یعنی اسلام انسان کے فکر و عمل کے تضاد کو بڑی آسانی سے حل کرتا ہے' عبادت و عمل کی کشمکش سے نجات دلاتا ہے' دین داری اور دنیاداری کے مراحل کو آسانی اور کامیابی کے ساتھ معین کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ قارون کو اُس کی قوم کے لوگوں نے کہا:

﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (القصص)

''اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس سے دارِ آخرت حاصل کرنے کی کوشش کرو اور مت بھولو تم دنیا سے اپنا

حصہ' اور لوگوں کے ساتھ احسان کرو' جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد مت مچاؤ' یقیناً اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بخششوں کو صحیح مصرف میں لگانا کمال انسانیت و کمال فطرت ہے۔ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ دنیا میں انسان کو موافق و مناسب حصہ کھانا اور موافق حصہ پہنا اور زیادہ مال سے آخرت کمانا اور مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہے۔[۲۱] ارشادِ ربانی ہے: ﴿یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۝۳۱﴾ (الاعراف) ''اے آدمؑ کی اولاد! اپنی زینت استوار کیا کرو ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو' البتہ اسراف نہ کرو' یقیناً وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ فطرت سے احتراز نیکی نہیں۔ مولاناؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں' کہ تقویٰ یہ ہے: اللہ کی دی ہوئی پوشاک جس سے انسان کے بدن کی تستر و آرائش ہو جو عبادت کے وقت دوسرے اوقات سے بڑھ کر قابل استعمال ہوتا ہے کہ بندہ اپنے ربّ کی بارگاہ میں اس کی نعمتوں کا اثر لے کر حاضر ہو' اس نے جو کچھ پہننے اور کھانے پینے کو دیا ہے اس سے تمتع کرے' اور اسراف نہ کرے۔[۲۲] اسی مفہوم میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی منقول ہے: ((اِعْمَلْ لِدُنْیَاكَ كَاَنَّكَ تَعِیْشُ اَبَدًا وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِكَ كَاَنَّكَ تَمُوْتُ غَدًا))[۲۳] ''اپنی دنیا کے لیے اس طرح کام کرو جیسے تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے لیے اس طرح کام کرو گویا تم کل ہی مر جاؤ گے''۔ اسلام وہ مکمل دین ہے جو انسان کے آگے ہر ممکن راستہ کھول دیتا ہے۔ عیسائیوں نے ناممکن راستہ ''رہبانیت'' کو اختیار کیا' جس کی انہوں نے بعد میں رعایت نہیں کی' یہ ان کے فکری غلو کی نمایاں مثال ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿وَ رَهْبَانِیَّةَ ِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ﴾ (الحدید:۲۷) ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی تھی' ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا' مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں' پھر وہ اس کی رعایت بھی نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کرنے کا حق تھا''۔ قرآن میں لفظ فکر متعدد مقامات پر آیا ہے' جیسے: ﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ۝۱۸﴾ (المدثر) ''اس نے غور کیا اور کچھ اندازہ کیا''۔ یہ لفظ فعل و فاعل دونوں پر دلالت کرتا ہے' یعنی پہلے آدمی کسی چیز پر نظر ڈالتا ہے' پھر اس پر غور و فکر کرتا ہے' جیسے فرمایا: ﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ۝۸۸﴾ (الصّٰفّٰت) ''پس اُس نے ایک نظر ستاروں پر ڈالی''۔ گویا قرآن کے تناظر میں یہ ذہنی غور و فکر ذاتِ انسانی سے مربوط ہے' کیونکہ کسی فکر کا وجود مفکّر کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العوانی اپنی کتاب ''جدید فکری بحران'' میں رقمطراز ہیں کہ حیوانات سے بھی ایسے اعمال صادر ہوتے رہتے ہیں جو انسانی غور و فکر کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن وہ غور و فکر کے نتائج نہیں ہوتے بلکہ فطری تقاضے ہوتے ہیں۔[۲۴] جیسے: ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ''نماز قائم کرو!'' اہلِ اصول کے یہاں صیغہ امر کے ذریعہ جو حکم دیا جاتا ہے اس کا نفاذ واجب پر ہوتا ہے' جبکہ اہلِ لغت کے یہاں جو امر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے وہ واجب العمل ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ نماز واجب ہے۔ مذکورہ مثال سے یہ بات سامنے آئی کہ نامعلوم چیزوں کے لیے اپنی معلومات کے مطابق دو مقدمات مرتب کر لیے جائیں' یعنی اصول و لغت۔ اس نتیجہ عمل کو فکر سے

موسوم کیا جاتا ہے۔اس باب میں قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ بے عمل غور وفکر ناپسندیدہ ہے۔گویا غور وفکر کے پیچھے کسی مقصد کا حاصل ہونا لازمی ہے' چاہے اس کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے ہو۔اس طرح ''فکر'' کے کچھ مقدمات اور کچھ حدود ہوتے ہیں۔ملت اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب وثقافت کو سمجھے اور اپنے افکار ونظریات کے سرچشموں کو پیش نظر رکھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ۝۷۲﴾ (النمل) ''آپؐ کہہ دیجیے کہ ہوسکتا ہے جس چیز کی تم لوگ جلدی مچا رہے ہو اُس کا کچھ حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو''۔ ﴿وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۝۷۷﴾ (النمل) ''اور یقیناً یہ (قرآن) ہدایت اور رحمت ہے اہلِ ایمان کے حق میں''۔گویا قرآنِ کریم قولی اور عملی فیصلہ کے لیے آیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں قوتِ گویائی رکھی: ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝۴﴾ (الرحمٰن) ''اس کو بیان سکھایا''۔بنی اسرائیل جن عقائد واحکام اور قصص وروایات کے اختلافات میں مبتلا تھے ان کا فیصلہ کن تصفیہ قرآن نے سنایا' جبکہ ہر معاملہ کا عملی فیصلہ قیامت میں ہوگا۔قرآن سمجھانے اور آگاہ کرنے کے لیے آیا ہے' باقی تمام معاملات کا حکیمانہ اور حاکمانہ فیصلہ اللہ ہی کرے گا۔ آپ ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ کسی کے اختلاف سے متاثر نہ ہوں' اللہ پر بھروسہ کر کے اپنا کام جاری رکھئے۔(۲۵) کیونکہ انسان فطری طور پر ایک دوسرے کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے' مگر عباد اللہ (اللہ کے بندے) صبر کیا کرتے ہیں: ﴿وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا۝۲۰﴾ (الفرقان)۔(۲۶) ''اور ہم نے تمہارے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا ہے۔(اے مسلمانو!) کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور آپؐ کا رب سب کچھ دیکھنے والا ہے''۔شبیر احمد عثمانیؒ مذکورہ آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ پیغمبر میں کافروں کا ایمان جانچنے اور کافر میں پیغمبروں کا صبر جانچنا' یہ سب اللہ کی نظر میں ہے' نیز سختی' نرمی' تندرستی' بیماری..... سے انسان کو جانچا جاتا ہے۔اشادِ ربانی ہے: ﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۝۳۵﴾ (الانبیاء) ''اور ہم آزماتے رہتے ہیں تم لوگوں کو شر اور خیر کے ذریعے سے۔اور تم سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹا دیے جاؤ گے''۔اسی طرح انسان کی آزمائش اصولِ دین اور فروعِ دین میں بھی ہے۔(۲۷) اور فروع میں کئی طریقے ہوں تو کوئی برا نہیں' اس لحاظ سے فروعی اختلاف کو برداشت کرنا ہی بہتر ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝۱۵۹﴾ (الانعام) ''(اے نبی ﷺ!) جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کر دیے اور وہ گروہوں میں تقسیم ہو گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے' پھر وہ انہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ وہ کرتے رہے تھے۔''

اختلاف کا اصل سبب

اہل مغرب کے نزدیک علم وآگہی کا سرچشمہ کائنات' محسوسات اور تجربات ہیں۔اُمت مسلمہ کے یہاں علم وآگہی کے دو مأخذ ہیں' ایک قرآن اور دوسرا سنت رسولؐ۔نیز اسلام کے نزدیک علم وآگہی کے مخصوص ذرائع ہیں جن میں عقل وحواس سرفہرست ہیں' اور دوسری طرف مغرب کے سماجی علوم اور اس کے مناہج ہیں جو وحی اِلٰہی کو

سرے سے نظر انداز کرتے ہیں' اسے علم وآگہی کا سرچشمہ ہی شمار نہیں کرتے۔اس طرح سے اہل مغرب سماجی علوم کی تحقیق ومطالعہ میں انہی طریقوں کو استعمال کرتے ہیں جن کا استعمال طبعی علوم کے لیے ہوتا ہے' نتیجہ کے طور پر مغرب کی یونیورسٹیوں میں انسانی اور سماجی علوم کی تعلیم حاصل کرنے والا مسلم نوجوان حیران رہتا ہے کہ آیا وہ علم وآگہی کے اسلامی منہج کو درست سمجھے یا مغربی منہج کو۔اس صورت حال میں مغربی افکار کے تشخص اور اس کے غلبہ سے ہٹ کر قرآن وسنت کے منہج کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک فکری اُصول وضع کرنا ازبس ضروری ہے' کیونکہ مسلمانوں کے پاس جو فکری ونظریاتی مناہج موجود ہیں۔ان کے منابع قرآن وحدیث میں ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝۱۷ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۸﴾ (الزمر)

(اے نبی ﷺ!) میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے۔جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں' پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو عقل مند ہیں۔''

اور حدیث پاک میں آیا ہے: ((اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ، فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا))(۲۸) ''حکمت ودانائی کی بات مؤمن کی گم شدہ پونجی ہے' پس جہاں بھی پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے''۔حکمت کے معنی اشیاء کے حقائق پر غور وفکر کرنا ہے۔اس لحاظ سے ضروری ہے کہ مغربی افکار ونظریات کا جائزہ قرآن وحدیث کی روشنی میں لیا جائے۔ارشادِ باری ہے: ﴿قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵﴾ (المائدۃ) ''آچکا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور بھی اور ایک روشن کتاب بھی''۔لہٰذا ہمیں موجودہ علمی وفکری سرمایہ کے سلسلے میں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ وہ مغرب کی دَین ہے بلکہ دورِ حاضر کے فکری سرمایہ کا جائزہ اس بلند نگاہ انسان کی طرح لینا چاہیے' کہ جس کے پاس اپنے مأخذ وہدایت کے سرچشمے ہیں' یعنی قرآن وسنت' جو انسان کو ہر انحراف اور خطرے سے بچانے کا اہم ذریعہ ہیں' جو ہمارے پاس محفوظ ہیں۔رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے: ﴿مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲﴾ (طٰہٰ) ''ہم نے آپؐ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپؐ مشقت میں پڑیں''۔اس کے باوجود جو لوگ قرآن وسنت کو اچھی طرح نہیں جانتے' خاص طور پر کم سن بچے جو ابھی فہم میں ناپختہ ہیں' یہ ان مغربی افکار ونظریات سے نہ دینی حیثیت سے نہ دنیاوی حیثیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' بلکہ اُلٹا نقصان میں پڑ جائیں گے' کیونکہ عصر حاضر کے افکار ونظریات کا سرمایہ مخلوط ہے۔اسی پر بس نہیں بلکہ تفسیری سرمایہ میں بھی ملاوٹ نظر آتی ہے۔اس لحاظ سے ترجمہ وتفسیر کے ذریعہ قرآن سمجھنے والے کو احتیاط سے کام لینا ازحد ضروری ہے' کیونکہ عقل ومذہب کا یہ تصادم تاریخ کے قدیم صفحات میں نظر نہیں آتا' جبکہ جدید تاریخ میں اس کا سراغ ترجمہ کے بعد والے زمانہ میں ملتا ہے۔عہدِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں عقل ومذہب میں لوگ کسی طرح کا بُعد وتناقص اور معرکہ آرائی نہیں جانتے تھے' بلکہ یہ دونوں پہلو بہ پہلو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے چل رہے تھے' دونوں میں کسی طرح کی کشاکش نہیں تھی' لیکن حالات نے ان دونوں میں فرق پیدا کر دیا' نتیجے میں نہ جانے کتنی کتابیں' خطبات اور رسائل اس قضیہ سے بھرے پڑے ہیں۔اس وجہ سے یہ امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔

اصل دین اور فروع میں مطابقت کے حدود

ارشادِ ربانی ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳﴾ (الشوری)

''(اے مسلمانو!) اللہ نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو' کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (اے نبی ﷺ) بہت بھاری ہے مشرکین پر یہ بات جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف (آنے کے لیے) چن لیتا ہے اور وہ اپنی طرف ہدایت اُسے دیتا ہے جو خود رجوع کرتا ہے۔''

مذکورہ آیت سے صاف مطلب نکلتا ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے' یعنی عقائد و اخلاق۔ اور اصول میں کوئی اختلاف نہیں تھا' بعض فروعات یعنی دین کو قائم کرنے کے طور طریق ہر وقت میں اللہ تعالیٰ نے جدا ٹھہرا دیے ہیں:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۴۸﴾ (المائدۃ)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے۔ اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا مگر اُس نے چاہا کہ وہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اُس نے تم کو عطا کی' تو تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے' پس وہ تمہیں جتلا دے گا ان چیزوں کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہے تھے۔''

فرقے بننے کی وجہ

باہمی ضد اور خود غرضی سے ایک اُمت منقسم ہو جاتی ہے' بے شمار فرقوں میں بٹ جاتی ہے' جیسے بنی اسرائیل میں باہمی ضد کی وجہ سے بے شمار فرقے بن گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۷﴾ (الجاثیۃ)

''اور ہم نے انہیں عطا کیں دین کے معاملہ میں واضح ہدایات۔ اور انہوں نے نہیں اختلاف کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔ یقیناً آپؐ کا رب فیصلہ کر دے گا ان کے مابین قیامت کے دن ان تمام باتوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔''

اندرونی اختلاف کو برداشت کرنا

مذکورہ بالا آیت میں نبی کریم ﷺ کے توسط سے پوری اُمت مسلمہ کو مخاطب کیا گیا ہے کہ ان ضدی لوگوں کی خواہشات پر مت چلیں۔ ان کی ایک خواہش یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ویسا ہی اختلاف وتفریق پڑ جائے جس میں وہ لوگ خود مبتلا ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (الجاثیۃ) ''پھر (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو قائم کر دیا دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر' تو آپ اسی کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جن کے پاس کوئی علم ہی نہیں ہے۔''

کسی گھر میں' قبیلے میں اور قوم میں باہمی تعلقات خراب کرنا' آپس میں تفریق ڈالنا شیطان کا کام ہوا کرتا ہے' لہٰذا اندرونی اختلافات وخلفشار کو ہمیشہ برداشت کرنا چاہیے۔ ان اندرونی اختلافات کو بڑھاوا دینے میں شیطان نما انسان کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ اُمت مسلمہ کو ان عناصر سے چوکنا وہوشیار رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اُمتِ مسلمہ کو شیطان نما انسان کی ان چالوں سے ہمیشہ محفوظ رکھے' کیونکہ یہ عناصر فروعی اختلافات کے ذریعہ سے حملہ کر کے اُمت کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

خلاصہ کلام

جن اُمور میں کوئی پہلو شر یا تکلیف کا ہو یا کسی صحیح مقصد کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو' ان کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' جیسے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں آیا: ﴿قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾﴾ (الکہف) ''اُس (نوجوان) نے کہا: دیکھئے' جب ہم ٹھہرے تھے چٹان کے پاس تو میں بھول گیا مچھلی کو (نگاہ میں رکھنا) اور نہیں مجھے بھلائے رکھا مگر شیطان نے کہ میں (آپؑ سے) اس کا ذکر کروں' اور اُس نے تو بنا لیا تھا اپنا راستہ دریا میں' عجیب طرح سے''۔ دوسری جگہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں آیا ہے: ﴿وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾﴾ (یوسف) ''اور یوسفؑ نے کہا اُس شخص سے جس کے بارے میں آپؑ نے گمان کیا کہ وہ ان دونوں میں سے نجات پائے گا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر بھی کرنا۔ تو اُسے بھلائے رکھا شیطان نے ذکر کرنا اپنے آقا سے' تو آپؑ رہے جیل میں کئی برس تک''۔ شیطان نے اس شخص کو بادشاہ کے یہاں یوسف کا ذکر کرنا بھلوا دیا۔ گویا یہ عمل شیطان کی جانب سے ہے۔ لہٰذا ان حالات میں اُمتِ مسلمہ اپنا ماضی پھر یاد کرے اور اس فرمانِ الٰہی کو پیش نظر رکھے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾﴾ (المائدۃ) ''اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو' اور گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں میں تعاون مت کرو' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے''۔ یعنی ہم مل جل کر نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کریں' اللہ سے ڈرتے ہوئے نیکی وبھلائی میں تعاون اور بدی وشر سے پرہیز کریں۔ اللہ تعالیٰ اُمت مسلمہ کو اس عذاب سے محفوظ رکھے' آمین!

حوالہ جات

(۱) فتح القدیر، علامہ شوکانی، جلد ٤،ص:٢٩٤۔

(٢) روح المعانی،علامہ آلوسی، جلد ٢٠،ص:٤٥١، الرسالۃ بیروت، ٢٠١٠ء۔

(٣) تفسیر طبری، علامہ ابن جریرؒ، جلد١٨، ص٤٩٥۔

(٤) فتح القدیر، علامہ شوکانی، جلد٤،ص٢٩٥۔

(٥) تفسیر طبری، امام ابن جریرطبریؒ،جلد١٨،ص٤٩٦۔

(٦) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیرؒ،جلد٦،ص٩٣ ۔

(٧) فتح القدیر، علامہ شوکانی،جلد٤،ص٢٩٥۔

(٨) صحیح مسلم، کتاب القدر،باب کل مولود یولد علی فطرۃ۔ وصحیح البخاری،کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الروم۔

(٩) امام جوزی،جلد٦،ص ٣٠٠ ۔

(١٠) تفسیر طبری، ابن جریرطبریؒ، جلد ١٨،ص٤٩٥۔

(١١) تفسیر المنار،علامہ رشید رضا مصری،جلد١،ص٦٧۔

(١٢) تفسیر عثمانیؒ ،ص١٧٦، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ۔

(١٣) بحوالہ تفسیر عثمانی،ص٥٠٩۔

(١٤) تفسیر عثمانی،ص٥٤٢۔

(١٥) تفسیر عثمانی،ص٤٦٠ ۔

(١٦) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب اکثر اھل الجنۃ الفقراء ......

(١٧) تفسیرثنائی،مولانا ثناء اللّٰہ امرتسری،جلد٢،ص ٣٩٠، الدارالسّلفیہ ممبئی۔دارالمعارف، ممبئی، ٢٠٠٠ء۔

(١٨) تفہیم القرآن،مولانا سیّد ابوالاعلی مودودیؒ،ج٣،ص ١٠، جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی، ١٩٧٢ء۔

(١٩) تفسیر عثمانی،ص ١٠٩۔

(٢٠) تفسیر عثمانی،ص٦٥٢۔

(٢١) تفسیر عثمانی،ص٥٢٥۔

(٢٢) تفسیر عثمانی،ص٢٠٥۔

(٢٣) امامِ قتیبہ کی غریب الحدیث، تحقیق ڈاکٹرعبد اللّٰہ الجبوری، مطبوعہ عراق، جلد ١، ص٢٨٩۔

(٢٤) جدید فکری بحران، ڈاکٹر طہٰ جابر العوانی،ص٢٣۔

(٢٥) تفسیر عثمانی،ص٥١١۔

٢٦ تفسیر ثنائی، مولانا ثناء اللّٰہ امرتسری، ج٢،ص٦٤٥، الدّارالسّلفیہ ممبئی۔ دارالمعارف، ممبئی،٢٠٠٠ء۔

(٢٧) تفسیر عثمانی،ص٤٣٣۔

(٢٨) جامع الترمذی،کتاب العِلم، باب فضل الفقہ علی العُبادۃ۔ سنن ابن ماجہ،ابواب الزھد،باب الحکمۃ ۔

❀❀❀

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

علامہ شبلی کی سیرت نگاری

امتیاز عبدالقادر ☆

علامہ شبلی نعمانیؒ کے مذہبی، تحقیقی، ادبی اور تنقیدی کارنامے نہایت متنوع، گوناگوں اور عظیم الشان ہیں، مگر سیرۃ النبی ﷺ ان کا شاہکار اور عظیم ترین کارنامہ ہے۔ ادبیات اسلامی میں سیرتِ رسولؐ ایک اہم نیم تاریخی، نیم سوانحی صنف ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول مسلمانوں کے بہت سے تاریخی اصول اور سوانحی نظریے سیرت نگاری سے ہی پیدا ہوکر ترقی پذیر ہوئے ہیں (۱)۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے سیرت رسول ﷺ کی تدوین میں جس احتیاط، دیانت داری اور جرح وتعدیل سے کام لیا ہے، اس کی نظیر دنیا کے انتقادی ادب میں ملنا محال ہے۔ اس پر یہ بھی حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ چنانچہ پروفیسر مارگولیتھ اسی غیر مختتم سیرت نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (۲):

"The biographers of Prophet Mohammad(SAW) form a long series which it is impossible to end but in which it would be honorable to find a place".

''محمد (ﷺ) کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر چیز ہے۔''

علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ﷺ کی پہلی دو جلدیں ان کی اپنی مرتب کردہ ہیں۔ یہ سادہ سوانح حیات نہیں بلکہ مؤلف کے بنیادی نصب العین کے اعتبار سے اسے دائرۃ المعارف النبویہ کہنا بہتر ہے۔ اپنی مکمل صورت میں یہ سیرت کے موضوع سے نکل کر اسلام کی صداقت اور حقانیت کے موضوع پر ایک کتاب بن جاتی ہے۔ تاہم اس کا سوانحی حصہ اپنی جگہ مکمل اور مفصّل ہے۔ (۳)

مستشرقین یورپ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو داغ دار کرنے کی جی توڑ کوشش کی ہے اور آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر طرح طرح کے بے بنیاد الزامات لگائے ہیں۔ ان کی تصانیف علامہ شبلی کی دسترس میں تھیں۔ ان کے پیش نظر تھا کہ ''سلسلۂ سیرۃ النبیؐ'' کی ایک جلد یورپین تصانیف کی وضاحت کے لیے خاص رہے گی، جس میں بتایا جائے گا کہ یورپ نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایہ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟

☆ ریسرچ اسکالر، کشمیر یونیورسٹی (سری نگر)

آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں' ان کے کیا جوابات ہیں؟(۴)

سیرۃ النبی ﷺ کی پہلی جلد میں کثیر مقامات پر حیاتِ نبویؐ کے متعلق مختلف واقعات کے ضمن میں یورپین مصنفین کے افکار و خیالات سے تعرض کیا گیا ہے اور اسلام و پیغمبر اسلام ﷺ پر ان کے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ دو تین مثالیں مندرج ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی قبل بعثت زندگی میں ایک واقعہ بحیرا راہب سے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عمر جب بارہ سال تھی تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ آپؐ نے شام (Syria) کا سفر کیا۔ اسی سفر میں بصریٰ کے مقام پر ایک عیسائی راہب جس کا نام بحیرا تھا' سے آپؐ کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس واقعے کے حوالے سے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر مسلمانوں کو شغف ہے' اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور' ڈریپر' مارگیولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے' انہی پر آنحضرت ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے۔ اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام حقائق سکھا دیے جائیں''۔(۵)

ڈریپر اپنی کتاب ''معرکہ علم و مذہب'' میں یوں افترا بازی کرتے ہیں:

''بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد (ﷺ) کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی۔ آپ کے ناتربیت یافتہ مگر اخاذ دماغ نے صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا''۔(۶)

سر ولیم میور نے بھی نہایت اہتمام سے ثابت کرنا چاہا کہ آنحضرت ﷺ کو بُت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپؐ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجربات اور مشاہدات کے نتائج تھے' لیکن ظاہر ہے کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ بالفرض ان عیسائی اساتذہ سے تعلیم یافتہ ہوتے تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اُن کے سینے میں پیدا ہوتا جو کہ قرآن کے ہر صفحہ پر نظر آتا ہے۔

مندرجہ ذیل بالا روایت کو ناقابل اعتبار ثابت کرتے ہوئے علامہ رقمطراز ہیں:

''اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں' یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا..... اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابو بکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے' حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور ابو بکرؓ بچے تھے.....''(۷)

سیرۃ النبی ﷺ کی ایک غایت یہ تھی کہ اس سے اخلاق کی اصلاح و تربیت کا کام لیا جائے۔ شبلی کے نزدیک

اصلاحِ اخلاق کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ نفوسِ قدسیہ کی زندگیوں کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے کیونکہ ''دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش ونگار ہیں''۔(۸)

اور اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مبارک یقیناً تمام فضائل اخلاق کا مجموعہ ہے' کیونکہ آپ ﷺ کی ہستی کو جامعیت کبریٰ کا درجہ حاصل ہے۔اس سب سے آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ تمام انسانی ضرورتوں میں اور تمام تمدنی اور انفرادی مسائل میں نصیحت' عبرت اور تربیت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ہر دور میں اہل باطل کو' اہل حق کی اخلاقی برتری کو دیکھ کر اپنی صورت کریہہ اور قبیح نظر آتی رہی ہے' اس لیے کبھی توپ وتفنگ کے میدان سجے' تو کبھی اخلاقی برتری نشانہ بنی' اور اس کا پہلا ہدف کاشانۂ نبوتؐ تھا۔''واقعۂ اِفک'' ہو(۹) یا ''مسئلہ ایلاء وتخییر''(۱۰) ان واقعات کو بنیاد بنا کر منافقوں اور مستشرقین نے بے جا اعتراضات کیے۔علامہ شبلی نے 'واقعہ ایلاء وتخییر' پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس قدر عموماً مسلم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات کی خاطر سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی' اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں۔جن کو عزیز مصر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحفتاً بھیجا تھا..... اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور نا قابل ذکر ہیں' لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیارِ اخلاق پر حرف گیریاں کی ہیں' ان کا گل سرسبد یہی ہیں' اس لیے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے''۔

آگے مولانا نے مفصل بحث کر کے دکھایا ہے کہ یہ تمام روایات سنداً بہت کم زور ہیں' پھر لکھا ہے:

> ''یہ بحث اصولِ روایت کی بنا پر تھی' درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدوکاوش کی حاجت نہیں۔جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جاسکتے' نہ کہ اُس ذات پاکؐ کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا' ﷺ''(۱۱)

علامہ شبلی نے سیرت پر یورپین مصنفین کی تصنیفات کا بھی پورا جائزہ لے کر ان کی تدلیسات' تلبیسات اور تحریفات کی پوری پردہ دری کی اور ان مستشرقین کی تین قسمیں بتا کر ان کو اچھی طرح مجروح کر دیا۔ایک قسم تو وہ ہے جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے تو بالکل واقف نہیں' مگر دوسروں کا سرمایۂ معلومات' تصنیفات اور تراجم کا سہارا لے کر اس مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھالتے رہتے ہیں۔دوسری قسم میں وہ ہیں جو عربی زبان اور اسلامی ادب' تاریخ اور فلسفہ سے ضرور واقف ہیں' اسی واقفیت کی بنا پر پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق نہایت دیدہ دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں رقم کرتے ہیں۔تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا حال یہ ہے کہ ع ''دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں''۔ان کو رد کر کے اپنے حسن عقیدت کے پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر آستانۂ نبوت پر چڑھائے۔اس کتاب کو قلم بند کرنے میں ان کا عقیدت مندانہ اور والہانہ جذبہ اُن پر ضرور چھایا ہوا ہے' لیکن اسی کے ساتھ ان کا انداز مؤرخانہ' محققانہ' محدثانہ اور متکلمانہ بھی ہے۔یہ مستشرقین جس استحکامِ رائے' منطقی استدلال اور تحقیقی امعانِ نظر سے اپنی کسی بات

کومنوانا چاہتے ہیں' علامہ نے اپنے غور وخوض کی قوت' محققانہ تجسّس' عالمانہ تجزیہ وتحلیل اور نتائج کے استنباط کرنے میں اپنے غیر معمولی فہم وادراک کو بروئے کار لاکر پوری کتاب قلم بند کردی ہے' اسی لیے یہ سیرت کی بے مثال کتاب بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی اور پشتو' انگریزی' ملیالم اور عربی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ (۱۲)

مؤرخین وارباب سیر ومغازی نے ناگزیر طور پر پیش آنے والے جنگی واقعات کا ذکر اس قدر تفصیل واستقصاء کے ساتھ کیا ہے کہ گویا آپ ﷺ کی زندگی کا مقصد ہی قتال ومحاربہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین اسلام نے رسول اللہ ﷺ کو ایک جنگ جو' اور حرب وضرب کا دلدادہ قرار دیا ہے۔ اسلام کے تصور جہاد پر مستشرقین نے اعتراض کیا۔ علامہ شبلی نے اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا جو مرقع تیار کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ آپؐ جنگ جو اور تلوار کے شیدائی نہیں تھے' بلکہ رحمتہ للعالمین اور امن وسلامتی کے پیغامبر تھے۔ مال غنیمت اور کشور کشائی کے حریص نہیں تھے' بلکہ حق وصداقت کے داعی اور منادی تھے۔ آپ ﷺ میں اور دنیا کے عام سپہ سالاروں اور فاتحوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔

علامہ نے سلسلہ غزوات کی بحث کا آغاز جن جملوں سے کیا ہے' وہ ان کے دل کش اسلوب کا شاہ کار اور ادب عالیہ کا نمونہ ہیں:

> ''کیا عجیب بات ہے' اربابِ سیر مغازی کی داستان جس قدر زیادہ درازنفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں' یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے' کیوں اس کو اسلام کے جور وستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے' اس کے نقش ونگار کے لیے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔ یورپ کے تمام مؤرخوں نے سیرتِ نبوی کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں' لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط اور سرتاپا غلط ہے' اس لیے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضروری ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے''۔ (۱۳)

علامہ شبلی اپنے گل ریز اور عطر بیز قلم سے پیغمبر اور فاتح کا فرق وامتیاز اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''جہاد کے معرکوں میں گو آپ ﷺ کے ہاتھ میں تیغ وسپر اور جسم مبارک پر خود مغفر ہوتا تھا' لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ عین اس وقت جبکہ معرکہ کارزار گرم ہے' تیروں کا مینہ برس رہا ہے' تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے' ہاتھ پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں' دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آ رہی ہیں' عین اسی حالت میں آنحضرتؐ کا دست دعا آسمان کی طرف بلند ہے' جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے۔ معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ' عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے' فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا' فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اُٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے' دفعتاً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے''۔ (۱۴)

سیرۃ النبی ﷺ میں انیسویں اور بیسویں صدی کے مخصوص علمی نظریات وافکار کا اثر نمایاں ہے مزید برآں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے خاص رجحانات بھی' جو سرسیّد کے زیر اثر اور ان کے زمانے میں کسی حد تک مسلّم

ومقبول تھے' کتاب پر چھائے ہوئے ہیں۔ بقول سید عبداللہ:

''اسلامی لڑائیوں کا خصوصاً آنحضرت ﷺ کے غزوات کا مدافعانہ ہونا یہ عقیدہ اس دور میں نہایت راسخ اور محکم تھا۔ شبلی نے اسی کو اصول و اساس بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پیغمبر تھے' سپہ سالار نہ تھے اور یہ بھی کہ آپؐ نے جنگ کو' جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے' اس قدر پاک اور منزّہ کر دیا کہ وہ اصل عبادت بن گئی' مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کا مقصد ملک گیری نہ ہو بلکہ انسانی ہمدردی اور کمزوروں کی حمایت اس کی غایتِ اصلی ہو''۔ (۱۵)

عرب کی قدیم تاریخ' اس کے اقوام و قبائل' اس کی حکومتوں' اس کے تمدن و تہذیب اور مذاہب وغیرہ کا ذکر کر کے دکھایا ہے کہ اسلام سے پہلے اس کی اور دنیا کی کیا ابتر حالت تھی اور اس کا اقتضا کیا تھا:

''یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی' کیا اس عام ظلمت' اس عالم گیر تیرگی' اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتاب عالم تاب کی حاجت نہ تھی؟''(۱۶)

محمد ﷺ ایک فلسفی نہیں تھے' نہ کسی مدرسے کے مدرس' آپؐ شاعر تھے نہ صوفی' بلکہ آپؐ نئی انسانیت اور نئے سماج کے معمار بن کر اُٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک دورِ تاریخ اور ایک نئی صالح دنیا ہمارے لیے پیدا کر دی۔ آپ ﷺ کی سیرت انفرادی سیرت نہیں ہے' آپؐ کا کارنامہ ایک ذات تک محدود کارنامہ نہیں ہے' آپؐ کا مسلک ایک شخص واحد کا پرائیویٹ مسلک نہیں ہے۔ وہ سیرت ایسی سیرت ہے جو ایک تحریک بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ کارنامہ ایسا کارنامہ ہے جو سلطنتوں کو فتح کرتی ہوئی ریاست کی صورت میں ملتا ہے' وہ اسوہ اور نمونہ' وہ سنت اور مسلک ایک ایسا فانوس جو ہزاروں مجلّہ آئینوں میں منعکس ہوتا ہوا ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایسی منتخب روزگار عملی ہستیوں کے کارناموں کی داستانیں سینکڑوں دماغوں کے اوراق پر لکھی جاتی ہیں اور ہزاروں دلوں کے صفحات پر کندہ ہوتی ہیں۔ نعیم صدیقی مرحوم کے الفاظ میں:

''ان کی بولی بے شمار زبانیں بولتی ہیں' ان کی چال بے شمار قدم چلتے ہیں' ان کا زاویہ نظر بے شمار آنکھیں اختیار کر لیتی ہیں' ان کے جذبات بے شمار سینوں میں موجزن ہو جاتے ہیں۔ ان کا طرزِ فکر ہزاروں دماغوں میں گھر کر لیتا ہے' ان کی داستانوں کے اوراق وقت کے سارے چمن میں بکھر جاتے ہیں' کسی کو لالہ اپنے سینے سے لگائے ملتا ہے' کسی کو نرگس آنکھوں پر رکھ لیتی ہے..... ان کی سیرت و سوانح اور ان کے اسوہ و سنت کو پڑھنے نکلیے تو ان کی ترتیب دی ہوئی جماعت کی کتاب پڑھیے۔ ان کے تعمیر کردہ سماج کا روزنامچہ مطالعہ فرمایئے اور ان کے ملفوظات و معمولات کو جا کر ان کے دور کی دُور دُور تک پھیلی تاریخ سے برآمد کیجیے۔ وہ سماج اور وہ جماعت اور وہ ریاست ہی ان کے کارنامے کو آگے منتقل کرنے کا اصل جامع ذریعہ ہے جسے ایسے لوگ تعمیر کر کے جاتے ہیں''۔ (۱۷)

'فتنۂ انکار حدیث' اپنے دور شباب کو عباسی عہد میں پہنچا جبکہ کوبہ کو مئے و مغاں اور مجلس مجلس رقص و رباب کے دور چلتے تھے۔ لونڈیوں کے لشکر درباروں میں بھرتی کیے جانے لگے' عیسائی اور یہودی خاص اہتمام سے عورتوں کو اپنے کاروباروں اور اداروں میں اور میخانوں میں رکھ کر نوجوانوں خصوصاً شاعروں کو لطف زندگی کا درس دیتے اور مسلم معاشرے کی اخلاقی قدروں اور حیادارانہ کلچر کی تباہی کی مہم چلائے ہوئے تھے۔ عباسی دور

میں جب یونانی لٹریچر لایا گیا' اس کے ترجمہ سے تحریک عقلیت (Rationalism) نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بحث یہ پیدا کر دی کہ پیغمبروں اور الہامی کتب ہدایت کے بغیر بھی آدمی اپنی فطرت کے تقاضے اور عقل کی کاوشوں سے ہدایت کی راہ پا سکتا ہے اور اسے آخرت میں خدا کی رضا حاصل ہو سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر نے طبقہ اہل خرد کے دینی شعور' جو کہ کمزور ہو چکا تھا' میں اس رجحان کو ضم کر دیا کہ عقل نہ صرف ہدایت کے لیے کافی ہے بلکہ نصوصِ قرآن کی تعبیر کرنے والی بالاتر اتھارٹی ہے اور یہی احادیث کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کرنے والی عدالت کی چیف جسٹس بھی ہے۔ اس طرح خوبصورتی سے مسلم سوسائٹی میں ''دُنیویت'' اور دین کی غیر محسوس علیحدگی کی کچی سڑک کو سیکولرزم (Secularism) کے موٹروے میں بدل دیا گیا۔ تحریک عقلیت ہادمِ دین اور غارت گر احادیث ثابت ہوئی۔ علامہ شبلی نے منطقی طور پر عقل کی محدودیت اور اس کی بندشوں کو مبرہن کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت پر جو عقلی شبہات واعتراضات مغربی مفکرین نے کیے' اُن کی قلعی علامہ شبلی نے اپنی سیرت میں کھول دی۔

ہر دور کے عقل پرستوں نے جب بیرونی اثرات کے تحت سوچنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی عقلیت کو کتاب وسنت کے مقابلے میں بالاتر اتھارٹی بنالیا۔ ایسے عناصر شریعت کے اصولوں کو مسخ کرنے کے لیے ایک طرف سنت سے بغاوت کا آغاز کرتے ہیں' حدیث سے روگردانی کرتے ہیں اور پھر قرآن کی آیات سے اپنی پسندے مفاہیم کھینچ تان کر نکال لاتے ہیں۔ ماضی میں معتزلہ کا مزاج بھی یہی تھا اور موجودہ عہد میں ماڈرن ازم' لبرل ازم اور سیکولرازم کی افواج کے لیے سڑکیں اور پل بنانے والی سفر مینار جمنٹ کا بھی یہی طرز عمل ہے۔ جب بھی کبھی کوئی فتنہ اٹھتا تو اس کے سامنے امت کا صالح عنصر سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کی موجوں کا زور توڑ کے اس کا رُخ بدل دیتا ہے۔ نیز ہر فتنہ اس امر کا باعث ہوا ہے کہ تاریخ کی درخشاں شخصیتیں اور تابندہ کردار ابھرتے ہیں' جن کی لمعانی آج بھی ہمارے لیے ایمان پرور ہے اور ایسا وقیع لٹریچر اسلامی اصول واحکام کے متعلق مرتب ہوا ہے جو ہمیشہ کے لیے سرچشمۂ فیض بن گیا ہے۔ کچھ یہی کام علامہ شبلی کی 'سیرۃ النبی ﷺ' نے بھی کیا۔

رسول کریم ﷺ پر کثرت ازدواج کی وجہ سے مغربی مفکرین نے بے ہودہ الزامات لگائے تو ان کا جواب دیتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

> ''رسول اللہ ﷺ نے ۵۳ برس تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سوا' جو شادی کے دن ۴۰ برس کی تھیں' کسی سے شادی نہیں کی۔ یہ شباب کا نہیں بلکہ انحطاط کا زمانہ ہے' اس لیے اگر مقصود ہوائے نفس ہوتی تو اس زمانے میں شادیاں کی ہوتیں۔ جو شادیاں کیں اکثر پولیٹیکل تھیں' یعنی ان کے ذریعے بڑے بڑے عرب قبائل سے اتحاد پیدا ہوا اور ان میں اسلام پھیلا''۔

عیسائی متعصب مستشرقین نے حضرت زینبؓ سے آنحضرت ﷺ کے نکاح کو نہایت رنگ آمیزی سے لکھا ہے۔ علامہ نے اصل واقعہ کو تفصیل سے لکھ کر دکھایا ہے کہ حضرت زینبؓ سے آپ ﷺ کے نکاح سے جاہلیت کی ایک قدیم رسم متبنیٰ' جو کہ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا تھا' مٹ گئی۔ اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیے۔ اس پر علامہ کا تبصرہ رعنائی بیان کا نمونہ ہے' لکھتے ہیں:

''واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی۔ مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتا پا کذب وافترا ہے' لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لیے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے''۔ (۱۸)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے فتح مکہ تک صنادید قریش نے آپؐ کے ساتھ سخت ظلم و جور روا رکھا۔ علامہ نے اہل مکہ کے ساتھ آپؐ کے عفو عام کی یوں تصویر کشی کی ہے:

''خطبہ کے بعد آپ ﷺ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے' ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام مٹانے میں سب سے پیش رو تھے' وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں' وہ بھی تھے جن کے تیغ وسنان نے پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں' وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے' وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے..... وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا ''تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟''

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے' شقی تھے' بے رحم تھے' لیکن مزاج شناس تھے' پکار اٹھے کہ:

اَخٌ کَرِیمٌ وابْنُ اَخٍ کَرِیْم"

تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے۔

ارشاد ہوا:

لاتثریب علیکم الْیوم اِذھبوا فانتم الطلقاء

تم پر کچھ الزام نہیں' جاؤ تم سب آزاد ہو'' (۱۹)

اربابِ سیر کے خیال میں گو آپ ﷺ نے اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا' لیکن دس شخصوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں۔ ان میں متعدد ایسے تھے کہ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ آپ ﷺ کو مکہ میں ستایا کرتے تھے اور آپؐ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان میں ایک دریدہ دہن عورت بھی تھی۔ علامہ شبلی کے نزدیک محدثانہ تنقید کی رو سے نہ یہ بیان صحیح ہے اور نہ روایت و درایت کے لحاظ سے یہ بالکل قابل اعتبار ہے۔ درایت کے اعتبار سے واقعہ پر تبصرہ جس مؤثر پیرایہ میں کیا ہے' ملاحظہ ہو:

''اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا۔ کفارِ قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت ﷺ کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں؟ باایں ہمہ انہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ ''**انتم الطلقاء**''۔ جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبتاً کم درجے کے مجرم تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ خیبر میں جس یہودی عورت نے آپؐ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمت عالم ﷺ کے طفیل سے جاں بر ہو سکتی ہے' تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیوں کر محروم رہ سکتے ہیں''۔ (۲۰)

اس کے بعد شبلی نے وضاحت کی ہے کہ اس موقع پر ابن خطل اور مقیس وغیرہ کو قصاص میں قتل کیا گیا۔

یوں تو شبلی کی بیشتر تصانیف کو وقت کی گرد ماند نہیں کر سکی ہے لیکن سیرۃ النبیؐ وہ تصنیف ہے جس کی چمک میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ اس شاہکار اور کارنامہ اعظم کے اسلوب میں سلاست و لطافت بھی ہے، روانی اور رعنائی بھی، شگفتگی، دلکشی بھی ہے، ایجاز و اختصار کا وصف بھی ہے اور استقلال و منطقیت بھی، طنز کی کارفرمائی بھی ہے اور رچا ہوا تاریخی شعور بھی، طرز ادا کی جدّت بھی ہے اور تحریر کی حلاوت بھی۔ اسلوب کی یہی کشش ہے جو دامن دل کو کھینچتی ہے کہ جا ایں جا است۔

حواشی

(۱) سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۳۸۔

(۲) *Mohammad (P.b.u.h) pg.3 by Margoloith*

(۳) سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۳۹

(۴) سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۱، ص ۱۰۳۔۱۰۲

(۵) ایضاً۔ ص ۱۱۹

(۶) بحوالہ ایضاً۔ ص ۱۱۹

(۷) ایضاً۔ ص ۲۰۔۱۱۹

(۸) ایضاً۔ ص ۲۔۱

(۹) سورۃ النور: آیت ۱۰

(۱۰) سورۃ تحریم: آیت نمبر ۱

(۱۱) سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۱، ص ۳۳۵

(۱۲) مولانا شبلی پر ایک نظر، ص ۱۲۲ از سید صباح الدین عبدالرحمان

(۱۳) سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۱، ص ۱۸۹

(۱۴) ایضاً، ص ۳۶۶

(۱۵) سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء، ص ۱۴۱

(۱۶) سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۱، ص ۱۲۸

(۱۷) رسولؐ اور سنت رسولؐ۔ ص ۱۹۵

(۱۸) سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۱، ص ۴۴۳

(۱۹) ایضاً، ص ۵۲۰

(۲۰) ایضاً، ص ۵۲۴

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : اسلام اور مستشرقین

مصنف : ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

ضخامت: 184 صفحات قیمت: 300 روپے

ملنے کے پتے: ☆ مکتبہ رحمۃ للعالمین، نذیر پارک، غازی روڈ، لاہور ☆ مجلس تحقیق الاسلامی J-99 ماڈل ٹاؤن، لاہور

مصنف کتاب ہذا ڈاکٹر حافظ محمد زبیر تحقیقی مزاج رکھنے والے نوجوان عالم دین ہیں۔ وہ حکمت قرآن کے ادارۂ تحریر کے رکن اور کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ چند قابل ذکر اور اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین معروف اسلامی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مستشرقین کے ان رویوں پر بحث کرتی ہے جو وہ اپنی تحقیق کی آڑ میں قرآن وحدیث اور دیگر اسلامی تعلیمات پر وارد کرتے اور حقائق کو مسخ کرتے ہوئے اسلام کو باطل دین ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کرتے ہیں۔ نیز رسول اللہ ﷺ کی حد درجہ پاکیزہ شخصیت پر جانتے بوجھتے اعتراضات کرتے ہیں۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ آغاز میں موضوع کا تعارف اور تالیف کا پس منظر اور مقصد بتایا گیا ہے۔ پہلے باب میں تحریک استشراق کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں چند معروف مستشرقین کا ذکر ہے جنہوں نے قرآن پر طرح طرح کے اعتراض کیے ہیں۔ تیسرے باب میں حدیث کے بارے میں مستشرقین کے چار رویّوں کا ذکر ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں سیرت النبیؐ کے مختلف گوشوں کو غیر معیاری ثابت کرنے اور تاریخ اسلام کے مستند واقعات کو غیر حقیقی بتانے کی کوششوں کا ذکر ہے۔ چھٹے باب میں فقہ اسلامی کے متعلق چند مستشرقین کی تحقیق بتائی گئی ہے۔ آخری باب میں مستشرقین کی تحقیقات کے سرچشموں کا ذکر ہے، جن میں ان کے چند تحقیقی مجلّات اور اہم انسائیکلوپیڈیاز کا تعارف کرایا گیا ہے۔

فاضل مصنف نے بڑی مہارت اور ذہانت کے ساتھ مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا عالمانہ اور مسکت جواب دیا ہے۔ کتاب خاص طور پر مسلم علماء کے پڑھنے کی چیز ہے۔

(۲)

نام کتاب : سرگزشت ایام

مصنف : حافظ نذر احمدؒ

ضخامت:273 صفحات قیمت : درج نہیں

ملنے کا پتہ : مسلم اکیڈمی 29/18 محمد نگر علامہ اقبال روڈ' لاہور

حافظ نذر احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ برصغیر کے طول وعرض میں بلکہ بیرون ملک بھی جہاں اردو دان موجود ہیں وہاں ان کا آسان ترجمہ قرآن متعارف ہے۔ حافظ صاحب خط وکتابت سکول کے بانی تھے۔ بذریعہ ڈاک ہزاروں لوگوں نے ان سے تعلیم پائی۔ حافظ صاحب کی ایک پہچان شبلی کالج ہے' جہاں سے طالب علم معمولی فیس کے ساتھ میٹرک' ایف اے' بی اے اور السنہ الشرقیہ کے امتحانات کی تیاری کر لیتے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب حافظ نذر احمد کے سوانح حیات پر مشتمل ہے' جو انہوں نے خود مرتب کیے مگر ان کے حین حیات شائع نہ ہو سکے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے کے پندرہ باب ہیں جس میں ان کا تفصیلی تعارف' زندگی کے مختلف مراحل' قرآن اور اسلام کی خدمات کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے کا عنوان ہے 'رفتید و لے نہ از دلِ ما'۔ اس حصے میں ان کے بیٹے' بیٹیوں اور دوسرے افراد خانہ نے ان کی حسین یادوں کو اپنے اپنے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ تیسرے حصے میں ان کے ہم عصر مشاہیر نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

حافظ صاحب نے ۹۲ سال کی عمر پائی۔ وہ قیامِ پاکستان کے وقت ۲۸ سالہ نوجوان تھے۔ وہ تقسیمِ ہند سے قبل اپنے آبائی وطن ضلع بجنور سے پاکستان آ چکے تھے۔ وہ قیامِ پاکستان کے حالات کے چشم دید گواہ ہیں کہ کس طرح مسلمان عورتوں' مردوں اور بچوں کو ظالمانہ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

حافظ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ آسان ترجمہ قرآن ہے' جس کا آغاز انہوں نے حرم مکہ میں بیٹھ کر کیا اور اختتامی سطور مسجد نبوی میں رقم کیں۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ترجمہ ہے جو ہر قرآنی لفظ کے نیچے اردو میں دیا گیا ہے اور پھر بامحاورہ ترجمہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اس ترجمے کو قبول عام حاصل ہوا اور لاتعداد مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

حافظ نذر احمد کی چند یادگار تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں' جن میں اپنے ہم عصر مشہور ومعروف شخصیات کے ہمراہ بیٹھے ہیں۔ کتاب نوجوانوں کے پڑھنے کی ہے تاکہ وہ جانیں کہ ایک مسلمان کس طرح اپنے شب وروز خدمت دین اور فلاح انسانیت میں گزارتا ہے۔

(۳)

نام کتاب : اربابِ علم وکمال اور پیشہ رزقِ حلال

مؤلف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت:232 صفحات قیمت : درج نہیں

ملنے کے پتے: ☆ مولانا سید محمد حقانی مدرس جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد ضلع نوشہرہ

☆ مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار لاہور

مولانا عبدالقیوم حقانی کثیر التصنیف اور زود نویس عالم دین ہیں۔ان کی کتابوں کو قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔علامہ عبدالکریم سمعانی کی ایک جامع اور نادر کتاب ''کتاب الانساب'' ہے جس میں انہوں نے مختلف پیشوں کے افراد کا ذکر کیا ہے جنہوں نے علم دین میں کمال حاصل کیا۔حقانی صاحب نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور انتہائی متاثر ہوئے۔ وہ اس کتاب کے ابواب پڑھتے گئے اور اپنے اس مطالعے کو مولانا سمعانی کے ساتھ ملاقات قرار دیتے رہے۔اپنی دوسری کتابوں کے علی الرغم اس کتاب میں مصنف کا اسلوبِ تحریر بھی نرالا ہے۔

اسلام کسی پیشے کے ساتھ منسلک ہو کر روزی کمانے کی حوصلہ افزائی بلکہ تلقین کرتا ہے۔ چونکہ حلال روزی کمانے کے تمام طریقے جائز اور مستحسن ہیں اس لیے مسلمانوں نے کاروبارِ زندگی کی مصروفیت کے باوجود علم دین میں گہری دلچسپی لی۔ چونکہ اس دور میں محنت مزدوری کر کے کمانے کو حقیر سمجھا جاتا ہے' اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس اسلامی نظریے کو عام کیا جائے کہ دنیوی پیشے میں مصروف ہو کر دین کا علم سیکھنے سے بے توجہی درست نہیں۔ چنانچہ مصنف نے اس کتاب میں ان افراد کا ذکر کیا ہے جو روزی کمانے کے لیے مختلف پیشے اختیار کرنے کے باوجود اربابِ علم وفضل بھی تھے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین کھانا وہ ہے جو تم اپنے کسب سے کماؤ اور کھاؤ۔''

مصنف نے کتاب میں ایسے صاحبِ علم وعرفان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جو پیشے کے اعتبار سے روغن ساز' درزی' پارچہ باف' قصاب' قلعی گر' کاتب' حلوائی' لوہار' خطاب' شکر ساز' مزدور اور صابن ساز تھے۔کتاب کے آخری باب میں ان باہمت علماء اسلام کا تذکرہ ہے جو نابینا تھے مگر ان کے دل روشن تھے' انہوں نے اپنے پیچھے علم وعرفان کے یادگار کارنامے چھوڑے۔

اس خیال کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ موچی' نائی' تیلی' قصاب اور مزدور حقیر پیشے نہیں بلکہ ہاتھ سے روزی کمانے کی وجہ سے معزز ہیں۔ نیز مسجدوں میں امامت اور خطابت کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ کوئی جائز پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں تاکہ وہ اپنی دنیوی ضروریات پوری کر سکیں۔

❁❁❁

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah An-Nisa—cont....

(Ayaat 101-115, inclusive)

Translator's Note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap from the previous issue: verses 88 – 100:

The reader would recall that we had concluded our previous translation and elucidation of Surah An-Nisa (Women) at verse 100. The underlying message of those 13 verses was a continuation of the charge sheet against the wicked and preposterous claims and deeds of the Munafiqun (hypocrites) and the Mushrikun (Polytheists).

The verses also dealt with the case of banished Jews who were showing a hostile and menacing attitude, in spite of the peace treaties they had made with the Muslims. They were openly siding with the enemies of Islam and hatching plots against the Holy Prophet (SAW) and the Muslim Community even at Al-Madinah itself. They were taken to task for their inimical behaviour and given a final warning to change their attitude and as we know from historical accounts, finally exiled from Madinah on account of their misconduct.

The problem of the hypocrites, who had become very troublesome at that time, was causing immense difficulties for the Believers. The hypocrites were, therefore, divided into different categories to enable the Muslims to deal with them appropriately.

Clear instructions were also given regarding the attitude they should adopt towards the non-belligerent clans. The most important thing needed at that time was to prepare the Muslims for the bitter struggle with the opponents of Islam. For this purpose greatest importance was attached to their character building, for it was obvious that the small Muslim Community could only come out successful, nay, survive, if the Muslims possessed high moral character. They were, therefore, enjoined to adopt the highest moral qualities and were severely criticized whenever any moral weakness was detected in them.

Furthermore, the verses informed the ignominy and ordeal that awaited the hypocrites both in this world and particularly in the Hereafter, viz., the torment of Hellfire.

Fresh Exposition: verses 101 through 115 of Surah An-Nisa.

Verse 101

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝

"When you go forth journeying in the land, there is no blame on you if you shorten the Prayer, (especially) if you fear that the unbelievers might cause you harm. Surely the unbelievers are your open enemies."

Shortening Prayers (qasr) while travelling in peace-time consists of praying two rak'ahs at those appointed times when one is normally required to pray four rak'ahs. The form of qasr during a state of war has not been specified. Prayers should, therefore, be performed as circumstances permit. People should pray in congregation if possible, otherwise individually. If it is not possible to turn towards the qiblah, one may keep the direction in which one happens to be facing. One may even pray while seated either on the back of an animal or on a vehicle. If actual bowing and prostrating are not possible, they may be performed with hand signals. If absolutely necessary, one may even pray while walking. One may also pray even though one's clothes are soiled with blood. If, in spite of these relaxations, a man still fails to manage to perform a Prayer within the prescribed time, he may defer it, following the precedent set by the Prophet (SAW) during the Battle of Trench.

There is jurisprudential disagreement regarding details of Qasr prayer, which is out of the scope of our exposition. What is, however relevant to this treatise is the Qur'anic expression in the verse 'there shall be no blame', which also occurs in the Qur'anic verse on the ritual of running between Safa and Marwah *(Al-Baqarah: 158)*. The actual words used in both verses apparently mean that these acts were not blameworthy even though the running, as we know, is part of the prescribed rites of Pilgrimage and is obligatory: We can appreciate the significance of both these Qur'anic verses if we remember that the purpose in each case is to dispel the misunderstanding that the acts concerned might either entail some sin or jeopardize a man's reward.

Verse 102

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ
وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ
عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى
اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

"(O Messenger!) If you are amongst the believers and rise (in the state of war) to lead the Prayer for them, let a party of them stand

with you to worship, keeping their arms. When they have performed their prostration, let them go behind you, and let another party who have not prayed, pray with you, remaining on guard and keeping their arms, for the unbelievers love to see you heedless of your arms and your baggage so that they might swoop upon you in a surprise attack. But there shall be no blame upon you if you were to lay aside your arms if you are either troubled by rain or are sick; but remain on guard. Surely Allah has prepared a humiliating chastisement for the unbelievers."

This injunction regarding Prayer in a state of either fear or insecurity (salat al-khawf) refers to the time when an enemy attack is anticipated, but the fighting has not yet begun. Regardless of the jurisprudential difference of opinion regarding Prayer during war (when the war has begun) it is an established fact that on four occasions during the Battle of Trench the Prophet (SAW) missed Prayers during the appointed times, but performed them subsequently in their correct sequence, even though the above-mentioned injunction regarding Prayer in the state of insecurity had already been revealed.

Moreover, the actual form of congregational Prayer in the state of insecurity depends, to a large extent, on the actual state of the hostilities. The Prophet (SAW) prayed variedly under different conditions. A Muslim commander may use due discretion and adopt whichever form of Prayer, mentioned in the Sunnah of the Prophet (SAW), he deems appropriately suited to the situational need.

The verse also emphasizes the fact that due precautions ought to be taken by the Muslim army while Praying during war, as the enemy would be waiting for a chink in the Muslim Army's armour to appear and apparently that may well happen if the whole army becomes oblivious of their weapons and turns towards Prayer simultaneously. Having said that, it must be emphasized that victory and defeat in wars ultimately depends on the Will of Allah (SWT). Therefore, even while taking these precautionary measures one should feel sure that He (SWT) will humiliate those who are trying to extinguish His (SWT) light.

Verse 103

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝

"When you have finished the Prayer, remember Allah -standing, and sitting, and reclining. And when you become secure, perform the regular Prayer. The Prayer is enjoined upon the believers at stated times."

This verse, although self-explanatory to a degree, needs the mention of two important points:

1- Even during a time as trying as war, the remembrance of Allah (SWT) is of paramount importance and the key to achieving His (SWT) bounty and victory. The same holds valid in times of peace.

2- Once the war has ended and Muslim army is secure from fear of the enemy, Prayers ought to be performed according to the normal routine at the prescribed times of the day/night.

Verse 104

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُوْنُوْا تَأْلَمُوْنَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُوْنَ كَمَا تَأْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

"Do not be faint of heart in pursuing these people: if you happen to suffer harm they too are suffering just as you are, while you may hope from Allah what they cannot hope for. Allah is All-Knowing, All- Wise."

This verse refers to those unbelievers who adamantly opposed the cause of Islam and the establishment of the Islamic order.

It is not a matter of astonishment that men of faith are required to endure the same degree of hardship for the sake of the Truth as unbelievers do for the sake of falsehood, and then some. This is true because, as the latter merely seek the transient benefits of worldly life whereas the faithful seek to please, and secure the proximity of the Lord of the Universe and look forward to everlasting rewards.

Verse 105

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۝

"(O Messenger!) We have revealed to you this Book with the Truth so that you may judge between people in accordance with what Allah has shown you. So do not dispute on behalf of the dishonest,"

These and certain other verses addressing the same subject matter that occur a little later on in the same Surah (verses 113 onward) and relate to an incident that took place around the time they were revealed. In effect, the verses act as an advocate in proclaiming that Justice and Truth are the cornerstones of a vibrant Islamic System. The incident involved a person of the Banu Zafar tribe of the Ansar, who stole another Ansari's armoured coat of chain mail. While the investigation was in progress, he put the coat of mail in the house of a Jew. Its owner approached the Prophet (SAW) and expressed his suspicion about this man (identified as one named Tu'mah in some commentaries). But Tu'mah, his kinsmen and many of the Banu Zafar colluded to ascribe the guilt to the Jew. When the Jew concerned was asked about the matter he pleaded that he was not guilty. Tu'mah's supporters, on the other hand, waged a vigorous propaganda campaign to save Tu'mah's skin. They argued that the wicked Jew, who had denied the Truth and disbelieved in Allah (SWT) and His Messenger (SAW), was absolutely untrustworthy, and his statement ought to be rejected outright. The Prophet (SAW) was about to decide the case against the Jew on the established formal grounds of visible evidence and sworn testimony, when the whole matter was laid bare by a revelation from Allah (SWT).

It is obvious that the Prophet's (SAW) judgement would have been in good faith based on the evidence available, but it would have provided the enemies of Islam an effective weapon against the Prophet (SAW) as well as against the entire Islamic community, and even Islam itself. They could have spread the word that the Prophet (SAW) and his followers were not concerned about right and justice: it would have been claimed that they were guilty of the same prejudice

and chauvinism against which they had themselves been preaching. It was specifically to prevent this situation that Allah (SWT) intervened in this particular case.

In this and the following verses Muslims were strongly censured for supporting criminals for no reason other than either family or tribal solidarity and were told that they should not allow prejudice to interfere with the principle of equal justice for all.

Verse 106

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ﴿۱۰۶﴾

"and seek forgiveness from Allah. Surely Allah is All-Forgiving, All-Compassionate."

This verse may be seen as a continuation of the previous one or as a stand-alone message. Either way, it is self-explanatory.

Verse 107

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙ﴿۱۰۷﴾

"Do not plead for those who are dishonest to themselves; Allah does not love him who betrays trust and persists in sin."

Whoever commits a breach of trust with others in fact starts by committing a breach of trust with his self. For the powers of his head and heart have been placed by Allah (SWT) at his disposal as a sacred trust, and by misusing them he is forcing those powers to support him in acts which involve a breach of trust. In doing so the person concerned suppresses his conscience, which Allah (SWT) has placed as a sentinel over his moral conduct, with the result that it is rendered incapable of preventing him from acts of wrong and iniquity. It is only after a man has already carried out this cruel suppression of conscience within himself that he is able to commit acts of sin and injustice on a regular basis outwardly, with no remorse. Acts of wrong committed involuntarily in the heat of the moment are a separate issue and excluded from the exposition of this verse. Moreover, acts of sin that are followed by guilt, remorse and eventual repentance are dealt with at other places in the Holy Book.

Verse 108

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝

"They can hide (their deeds) from men but they cannot hide (them) from Allah for He is with them even when they hold nightly counsels that are unpleasing to Allah. Allah encompasses all their doings."

The style of the verse gives an indication that it is general in the sense that no deed of man is hidden from Allah (SWT), the Omniscient, the Omnipresent; it does however apply ever so accurately on the routinely sinful deeds of hypocrites, who tried to hide their true identity and their evil actions from the people so that they could be immune from general criticism. The verse reveals that actions were not hidden from Allah (SWT) who knew all their plots and secrets and He (SWT) was always with them even when they used to plot and scheme at night in secret meetings, which Allah (SWT) has disapproved of.

Verse 109

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝

"You pleaded on their behalf in this worldly life but who will plead with Allah on their behalf on the Day of Resurrection, or who will be their defender there?"

Continuing the subject from the previous verse, Allah (SWT) criticizes the hypocrites that even though they can get decisions in their favour in this world by lying and betraying the Muslims, since the believers plead in their favour according to what is apparent to them, but how will anyone be able to plead for them with Allah (SWT) on the Day of Judgment, as He (SWT) knows everything and nothing is hidden from Him.

Verse 110

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"He who does either evil or wrongs himself, and then asks for the forgiveness of Allah, will find Allah All-Forgiving, All-Compassionate."

Even though they (the hypocrites) have committed great sins, yet Allah's (SWT) mercy is far greater than that and thus those who sincerely feel remorse and repent afterwards, Allah (SWT) assures them of His (SWT) forgiveness. In other words, those who do evil or wrong their own souls but later feel guilty and sincerely seek the pardon of Allah (SWT) will find Him Forgiving and Merciful.

Verse 111

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

"He who commits a sin, commits it only to his detriment. Surely Allah is All-Knowing, All-Wise."

The verse teaches a vital lesson to mankind, i.e., no one shall bear the burden of another and every soul will be responsible for its own deeds. The fruition of that sin may come to haunt him in this world, but the real punishment is that of the Hereafter. This, of course holds valid when death overtakes the repentance from sins. The rest of the verse is oft-repeated and self-explanatory.

Verses 112 & 113

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

"But he who commits either a fault or a sin, and then casts it upon an innocent person, lays upon himself the burden of a false charge and a flagrant sin."

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

"(O Messenger!) But for Allah's favour and mercy upon you, a party of them had resolved to mislead you, yet they only misled themselves, and could not have harmed you in any way. Allah revealed to you the Book and Wisdom, and He taught you what you knew not. Great indeed has been Allah's favour upon you."

Verses 112 and 113 are intertwined and need to be addressed as a pair.

Even if some people succeeded in their design to obtain from the Prophet (SAW) a judgement in their favour by presenting a false account of events, the real loss would have been theirs rather than the Prophet's (SAW). For the real criminals in the sight of Allah (SWT) are the perpetrators of that fraud and not the Prophet (SAW) who, in good faith, had delivered a verdict that was based on the evidence presented but actually did not conform to the facts. Whoever obtains a judgement in his favour by tricking the courts deludes his self into believing that by such tricks he can bring right to his side; but Allah (SWT) has ordained that right remains with its true claimant regardless of judgements obtained by fraud and deception.

Verse 114

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"Most of their secret conferring are devoid of good, unless one secretly enjoins in charity, good deeds, and setting the affairs of men right. We shall grant who ever does that seeking to please Allah a great reward."

In this verse Allah (SWT) commands His servants not to hold secret counsels amongst themselves of vain talk and may well lead to disobedience, rather they should exhibit openness in their actions and consultations. If, however, the cause and intent for secrecy is noble; such as non-obligatory charity (Sadaqah), good and righteous deeds which Allah (SWT) has ordained or bringing conciliation between two parties, Islam permits due secrecy. In fact Allah (SWT) promises rich rewards for such actions provided that they were done only for the pleasure of Allah (SWT) and the good of people in general; not for worldly benefits.

Verse 115

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝

"As for him who sets himself against the Messenger and follows a path other than that of the believers even after true guidance had

become clear to him, We will let him go to the way he has turned to, and We will cast him into Hell - an evil destination."

When, after revelation from Allah (SWT), the Prophet (SAW) delivered his verdict in favour of the innocent Jew rather than the dishonest Muslim, the latter was so seized by un-Islamic, egotistic and chauvinistic considerations that he left Madinah, went straight to Makkah to join the ranks of the enemies of Islam and of the Prophet (SAW), and undertook open opposition. The verse alludes to that incident in which Allah (SWT) decrees that for such devious behaviour the only 'reward' in the Hereafter is Hellfire, which is a miserable abode; the worst of the worst.

And Allah *(SWT)* Knows Best!

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
July - Sep. 2015 Vol.34 No.3

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک پا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ